غالب

احوال و آثار

ARTICO

یف نقوی

غالب ــ احوال و آثار

حنیف نقوی

ریڈر شعبۂ اردو ـ بنارس ہندو یونیورسٹی ـ وارانسی

نصرت پبلشرز ـ امین اباد لکھنؤ

۲۲۶۰۱۸

انتساب

عظیم محقّق اور غالب شناس

اور

عظیم تر انسان

مولانا امتیاز علی عرشی (مرحوم)

کے نام

کتاب کا نام	غالب۔ احوال و آثار
طباعت	نامی پریس۔ لکھنؤ
ناشر	نصرت پبلشرز۔ امین آباد۔ لکھنؤ
تعداد	پانچ سو (۵۰۰)
اشاعت	۱۹۹۰ء

قیمت

۶۰ روپے

فہرست مضامین

پیش گفتار

مرزا غالب اردو کے وہ تنہا بلند پایہ اور خوش نصیب ادیب و شاعر ہیں جن کے بارے میں لکھنے کا سلسلہ ایک صدی سے زائد عرصے سے جاری ہے اس عرصے میں ان کے متعلق مستقل تصانیف اور متفرق مضامین کی صورت میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب غالبیات کے کسی پہلو پر قلم اٹھانا خود کو آزمائش میں ڈالنے کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ محررِ سطور نے اس خطرہ کے باوجود اس میدان میں قدم رکھا ہے اور بعض موضوعات کے سلسلے میں اپنے انداز میں غور کرنے اور اپنے طور پر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نتائج بعض اہل علم کے لیے ناقابل قبول ہوں لیکن علمی معاملات میں اس قسم کے اختلافات ہمیشہ خوش آیند ثابت ہوتے ہیں اور بہ مرورِ ایّام ان سے اصل حقائق تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تحقیق کا کارواں دراصل اختلافات کے سہارے ہی آگے بڑھتا ہے۔

پیشِ نظر مضامین نومبر ۱۹۸۰ء اور اگست ۱۹۸۷ء کے درمیان ملک کے مختلف علمی و ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل کرنے کی غرض سے ان میں موقع بہ موقع تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور اضافے بھی کہ انھیں دوبارہ جوں کا توں شائع کر دینا علمی دیانت کے منافی اور آداب

تحقیق کے خلاف معلوم ہوا۔ نظرِ ثانی کے اس عمل کے باوجود ان تحریروں میں بعض خامیوں اور کوتاہیوں کا باقی رہ جانا خارج از امکان نہیں۔ اگر اربابِ نظر نے اس طرف توجہ فرمائی تو یہ ایک علمی خدمت بھی ہوگی اور محرّرِ سطور کی قدر افزائی بھی۔

مخدومی جناب مالک رام اردو کے ان قابلِ احترام مصنّفین میں شامل ہیں جن کی تحریروں میں محققانہ دقّتِ نظر اور عالمانہ بصیرت قدرِ اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے غالب کا مطالعہ مقصود ہو یا اُن کے بارے میں کچھ لکھنا ہو تو ان کے مضامین اور مصنّفات سے نہ صرف یہ کہ صرفِ نظر ممکن نہیں بلکہ انکی فراہم کردہ معلومات اور نتائجِ تحقیق کو معرضِ بحث میں لائے بغیر کوئی نتیجہ خیز گفتگو ہی نہیں کی جا سکتی۔ ان مضامین میں سے دو مضمون تو براہِ راست ان کی گراں قدر تصنیف "تلامذۂ غالب" سے متعلق ہیں۔ باقی مضامین میں بھی ان کے اقوال و بیانات زیرِ بحث آئے ہیں اور حسبِ ضرورت ان کی رایوں سے اختلاف بھی کیا گیا ہے۔ میری خواہش تھی کہ موصوف اس مجموعے کا مقدمہ تحریر فرمائیں تاکہ میرے طریقِ کار کی عمومی کیفیت کے علاوہ ان کے ارشادات سے اختلاف کے بارے میں خود ان کے تاثرات بھی قارئین کے پیشِ نگاہ رہیں۔ میں اس بزرگانہ شفقت کے لیے موصوف کا انتہائی ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی ناسازیٔ طبع اور معذوری کے باوجود میری اس درخواست کو شرفِ قبول عطا فرمایا اور اس طرح اس مجموعہ کو ان کے مقدمے سے مزیّن ہوکر منظرِ عام پر آنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

حسبِ سابق اس مجموعہ کی ترتیب و اشاعت بھی جناب عابد سہیل کے اصرار اور توجّہ کی رہینِ منّت ہے۔ محرّرِ سطور اس عنایتِ مکرّر کے لیے ان کا شکر گذار ہے۔

حنیف نقوی

یکم مارچ ۱۹۹۰ء

پیش لفظ

"تحقیق" دراصل "تلاشِ حق" کا دوسرا نام ہے۔ دیکھا جائے تو ہم میں سے ہر ایک شخص محقق یعنی متلاشیِ حق ہے۔ ہماری ساری زندگی اسی تلاش میں گذر جاتی ہے کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ جس کام کو ہم صحیح یعنی حق خیال کرتے ہیں، اسے کر ڈالتے ہیں۔ اور جسے صحیح نہیں سمجھتے اسے نہیں کرتے۔ یہی "تحقیق" ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں، یا جو بات ہم نے حق تسلیم کرلی ہے وہ واقعی حق یا صحیح ہو بھی ــــ ممکن ہے کہ ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں، وہ غلط ہو اور حقیقت اس کے علاوہ کچھ اور ہو۔ ہو سکتا ہے کہ معاملے کے تمام پہلوؤں پر ہماری نظر نہ پڑی ہو اور کچھ باتیں ہماری دسترس سے باہر رہ گئی ہوں۔ یا ہمارے استدلال میں کوئی کمی رہ گئی ہو، جس کے باعث ہم صحیح نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہ گئے۔ اس سے ہماری تحقیق یا حق معلوم کرنے کی کوشش پر کوئی حرف نہیں آتا۔ تحقیق اس کوشش اور تلاش کا نام ہے جو ہم نے کسی بات کی حقیقت اور اصلیت معلوم کرنے میں صرف کی، اس کا نتائج کے غلط یا صحیح ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اب علم و ادب میں "تحقیق" کا لفظ ایک اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے اور اسے انگریزی کے لفظ "ریسرچ" کا ہم معنی اور متبادل تسلیم کرلیا گیا ہے۔ ماضی میں ہمارے ہاں تحقیق کا کوئی الگ شعبہ نہیں تھا

البتہ "تنقید" کی مستقل حیثیت تھی۔ اور اس کے کچھ اصول بھی مرتب ہوئے۔ یوں بھی دیکھا جائے تو تنقید اور تحقیق کا چولی دامن کا ساتھ ہے، تنقید اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں تحقیق کا عنصر نہ ہو۔ شاید اسی لیے ہمارے علما نے ماضی میں تحقیق کو مستقلاً موضوعِ کلام تسلیم نہ کیا ہو!

آج ہماری بیشتر یونیورسٹیوں اور علمی اداروں میں تحقیق (ریسرچ) مستقل شعبۂ علم ہے۔ بلکہ یونیورسٹی میں ملازمت حاصل کرنے کے لیے کسی منظور شدہ موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے پی، ایچ، ڈی کی سند حاصل کرنے کی شرط عائد کر دی گئی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بسا اوقات طلبہ کافی محنت نہیں کرتے، نہ ان کے نگراں ہی ان کی کماحقہ، رہنمائی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بہت سی ناقص اور ادھوری چیزیں شائع ہو رہی ہیں، جس سے لوگوں کا استادوں اور شاگردوں ——— ہر دو پر سے اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔

کہیں کہیں اس کلیّہ سے استثنار بھی نظر آتا ہے۔ ایسے ہی ہمارے ڈاکٹر حنیف نقوی ہیں۔ وہ پچھلے کئی برس سے بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ علمی اور ادبی پہلو سے ہم انھیں "نجیب الطرفین" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ان کے دادھیال اور ننھیال ہر دو میں پشتوں سے علم و ادب کی روایت چلی آ رہی ہے، اور وہ اس کے جائز اور باوقار وارث ہیں۔ انھوں نے اپنی محنت اور انہماک سے بزرگوں کے سرمایے پر قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کا مزاج تحقیقی ہے، اور اپنے مطالعے کی وسعت اور گہرائی سے، انھوں نے اپنے آپ کو اس نوع کے موضوعات پر بحث

کرنے کا اہل ثابت کر دیا ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

پچھلے چند برس میں انہوں نے غالب کی شخصیت اور کلام سے متعلق بعض موضوعات پر تحقیق کی ہے۔ انہیں میں سے چند مضمون اس مجموعے میں شائع ہو رہے ہیں۔

تحقیق میں اوّلین شرط وسعتِ معلومات ہے۔ جب تک کسی موضوع سے متعلّق وہ تمام مواد آپ کے پیشِ نظر نہیں ہے جو پیش رو جمع کر گئے ہیں آپ کبھی دعوے سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ کوئی نئی چیز پیش کر رہے ہیں اور آپ ایسا نہیں کرتے تو دوسروں کے پیش کردہ نتائج کو دوہرا دینے سے فائدہ؟ پس محقّق کا فرض ہے کہ کسی موضوع پر لکھنے سے قبل وہ تمام موجود ماخذوں تک رسائی حاصل کرے، اور کوئی ماخذ سہل الحصول نہیں تو پوری کوشش کر کے اسے حاصل کرے، انھیں توجّہ سے دیکھے اور پورے غور و فکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچے۔ آپ دیکھیں گے کہ ڈاکٹر حنیف نقوی نے ہر جگہ اسی اصول پر عمل کیا ہے۔ کاتا اور لے دوڑی کا رویّہ محقّق کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ موصوف نے اس سے اجتناب کیا ہے۔ اسی روش نے ان کی تحریر میں وقار اور ان کے اخذ کردہ نتائج میں وزن پیدا کر دیا ہے۔

غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے کچھ زیادہ لکھا۔ منظوم کلام کے علاوہ نثر میں ان کا اہم سرمایہ اردو خطوط کے دو مجموعوں عودِ ہندی اور اردوئے معلّیٰ اور فارسی میں پنج آہنگ اور دستنبو اور قاطع برہان (درفشِ کاویانی) پر مشتمل ہے۔ ان کی سوانح عمری مرتّب کرنے کے لیے یہ اوّلین

اور بنیادی ماخذ ہیں۔ غالب کا کوئی سوانح نگار کسی عنوان ان سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ لیکن چونکہ حالات کسی ایک جگہ مرتّب صورت میں نہیں ملتے، اس لیے ان کا مطالعہ بہت دقّتِ نظر کا طالب ہے، اور ان سے نتائج اخذ کرنے کے لیے اصابتِ رائے کی اشد ضرورت ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ موصوف نے اس پہلو سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

تحقیق میں کسی بات کو حرفِ آخر کا درجہ دینا بہت مشکل ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ غالب کے سلسلے میں تو یہ بالخصوص اور بھی مشکل ہے آئے دن کوئی نہ کوئی چیز منظرِ عام پر آجاتی ہے، جس سے پہلے کے مسلّمہ فیصلے پر نظرِ ثانی کرنا پڑتی ہے۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ آپ کو ڈاکٹر حنیف نقوی کے کسی نتیجے سے اختلاف ہو۔ لیکن اس سے اس کی قدر و قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ ہر طرح داد کا مستحق ہے اور رہے گا۔

خود مجھے ان سے بعض جگہ اختلاف ہے۔ مثلاً انھوں نے پہلے ہی مضمون "غالب کا سالِ ولادت" میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ غالب نے جو اپنی تاریخ ولادت (۸ رجب ۱۲۱۲ھ) لکھی ہے، یہ صحیح نہیں۔ ان کے نزدیک وہ ۱۲۰ ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے نظریے کی تائید میں متعدد دلائل فراہم کیے ہیں، جو آپ ان کے مضمون میں ملاحظہ کریں گے۔

میرے خیال میں ان کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ غالب نے قیاسی اور تخمینی انداز میں اپنی عمر متعدد جگہ لکھی ہے، اور اس میں اختلاف ہے۔ اسی سے

موصوف نے گفتگو کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ جب بھی صراحت سے اپنی تاریخ ولادت کا ذکر کرتے ہیں تو سال ۱۲۱۲ھ یا تاریخ ۸ رجب (۱۲۱۲ھ) ہی لکھتے ہیں عمر سے متعلق تخمین اور قیاس اس صراحت کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ لوہارو خاندان ان کا اپنا خاندان ہے جہاں وہ خود اپنے قول کے مطابق سات برس کی عمر سے آتے جاتے رہے۔ میرا اپنا گمان ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں بہت پہلے کے (یعنی ہندوستان آنے سے بھی پہلے کے) باہمی تعلقات تھے۔ غالب کی چچی اسی خاندان سے تھیں۔ پس، اگر کوئی ان کی تاریخ ولادت اور عمر کے بارے میں واقف ہونے کے موقف میں تھا تو لوہارو خاندان کے اکابر اُن میں سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اور ممکن نہیں تھا کہ وہ ان حضرات سے غلط بیانی کرتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صراحت سے اپنی تاریخ ولادت اور عمر اور بچپن کے حالات کا ذکر کرتے ہیں، تو لوہارو خاندان ہی کے افراد سے۔ اگر ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ان کی صحیح تاریخ ولادت نہ ہوتی تو وہ کبھی ایسا نہیں کہہ سکتے تھے۔ اسی مضمون میں انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

> غالب اپنے اس اعلان کے باوجود کہ "فقیر میں جہاں اور عیب ہیں، ایک یہ بھی عیب ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا۔" اور اس دعوے کے باوصف کہ
>
> صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
> کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
>
> صادق القول ہرگز نہیں تھے اور مصلحت کے حدود سے آگے

بڑھ کر صرف بطور تفریح جھوٹ بولنے میں مطلق تامّل نہیں کرتے تھے۔ اس لیے ہمیں اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے اس بنیادی حقیقت کا بھی اعتراف کرنا ہوگا۔

بزرگوں نے کہا ہے کہ کسی شخص کے کردار سے متعلّق فیصلہ کرنا چاہو، تو دیکھو کہ اس کے دوست و احباب کون ہیں، وہ کن لوگوں سے ملتا جلتا ہے، اس کے ملنے والوں کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے، وہ معاملہ کا کیسا ہے۔ دیکھیے غالبؔ کے دوستوں میں من جملہ اور اصحاب کے کم و بیش ان کے ہم عمروں میں کون لوگ ہیں۔ مفتی محمد صدرالدین خاں آزردہ، مولوی فضل حق خیرآبادی، نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ، حکیم محمود خاں، حکیم احسن اللہ خاں، حکیم مومن خاں مومنؔ۔ خردوں میں: سر سیّد احمد خاں، حالی، نیّر رخشاں وغیرہ۔ میں نے عمداً ان لوگوں کے نام لکھے ہیں جن سے ان کی خط و کتابت ہمارے سامنے ہے۔

ان ناموں کو دیکھیے: یہ اس وقت کی دلّی کی سوسائٹی کی ناک تھے۔ ان اصحاب کے تدیّن اور تقویٰ، بلند پایگی اور برگزیدگی، خوش معاملگی، اور اخلاقِ حمیدہ کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اور یہ لوگ غالبؔ کے عمر بھر کے بے تکلّف، دلی دوست، مدّاح، ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔ اگر بقول ڈاکٹر حنیف نقوی، غالبؔ کی جھوٹ بولنے کی عادت "بنیادی حقیقت" کا درجہ رکھتی ہے، اور وہ واقعی ایسے ہی دروغ گو تھے، تو کیا ان کی ان اصحاب سے نبھ سکتی تھی؟

یاد رہے کہ مرزا کوئی امیر کبیر اور وزیر سلطنت نہیں تھے۔ دنیوی لحاظ سے وہ ان میں سے بیشتر اصحاب کے پاسنگ بھی نہیں تھے۔ کسی کی حاجت روائی کی بھی ان میں مقدرت نہیں تھی کہ لوگ محض تملّق یا کسی مصلحت اور خودغرضی کی خاطر ہی انھیں

برداشت کر لیتے۔ پس، ماننا پڑے گا کہ ان اصحاب سے ان کے تعلّقات محض شخصی اور قدردانی اور مرتبہ شناسی کے تھے۔ اگر غالب ایسے ہی "جھوٹ بولنے میں مطلق تامّل نہ کرنے والے" تھے تو کیا ان لوگوں کو اس کا ساری عمر احساس تک نہ ہوا!

لیکن میری یہ گذارشات اپنی جگہ! ان سے ڈاکٹر حنیف نقوی کی تحقیق اور کاوش پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انہوں نے ہر ایک موضوع سے متعلق جتنا مواد یکجا کر دیا ہے اور آئندہ کام کرنے والوں کی جو رہنمائی کی ہے، اس کے لیے اردو دنیا کو انھیں داد دینا چاہیے، اور ان کا شکر گذار ہونا چاہیے۔

مالک رام

غالب کا سالِ ولادت

غالب کے سالِ ولادت کا قدیم ترین ماخذ ان کا کلیاتِ نظمِ فارسی ہے جس کا نقشِ اوّل ۱۲۵۲ھ (۳۷-۱۸۳۶ء) میں تیار ہوا تھا۔ اس مجموعے کے خاتمے میں انھوں نے لکھا تھا کہ "تا امروز کہ از ہجرت خاتم الانبیاء علیہ التحیۃ والثنا یک ہزار و دو صد و پنجاہ و سہ سال گزشتہ، رصد نگارِ طالعِ من باندازۂ خواہشِ پیکِ آسمانی در مشاہدۂ آثارِ سالِ چہل و یکم است"[1]۔ ۱۲۵۳ھ میں عمر کی اکتالیسویں منزل سے گزرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ولادت ۱۲۱۲ھ میں ہوئی تھی۔ ایک رباعی میں جو اسی خاتمۂ کلیات میں شامل ہے، اس اجمال کی اس طرح توضیح کی گئی ہے:

غالب چو ز ناسازیِ فرجام نصیب ہم بیمِ عدو دارم و ہم ذوقِ حبیب
تاریخِ ولادتِ من از عالمِ قدس ہم "شورشِ شوق" آمد و ہم "لفظِ غریب"

"شورشِ شوق" اور "غریب" دونوں سے ۱۲۱۲ھ برآمد ہوتا ہے اور یہی وہ سالِ ہجری ہے جسے غالب کے سوانح نگار بالاتفاق ان کا سالِ پیدائش تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ سالِ ولادت کی اس اوّلین روایت پر تاریخِ ولادت کا اضافہ تقریباً ۲۴ سال کے بعد ذی قعدہ ۱۲۷۷ھ مطابق جون ۱۸۶۱ء میں ہوا جب کہ خود غالب نے نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی کے نام ایک خط میں اپنی سرگزشتِ حیات بیان کرتے ہوئے انھیں یہ اطلاع دی کہ "میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ ہجری کو مَیں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا"۔ اس اطلاع کے

دو سال بعد ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں کلیات نظم فارسی کا دوسرا ایڈیشن مطبع نول کشور سے شائع ہوا تو اس کے ساتھ ایک زائچہ ولادت بھی منظر عام پر آیا۔ یہ زائچہ حضرت امام حسین کی منقبت کے ایک قصیدے کی تشبیب سے متعلق ہے اور اس عنوان کے ساتھ شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔

زائچۂ طالعِ ولادتِ سعادت مطالع جناب غالب مدظلہ العالی
کہ بوقت چار گھڑی پیش از طلوعِ صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۲ھ
مطابق آغاز ۱۷۹۸ عیسوی روئے دادہ

اس زائچے کے ساتھ اگر یہ عنوان یا سرنامہ نہ ہوتا تو یہ ماہرینِ علم نجوم کے علاوہ کسی اور کی دلچسپی کی چیز نہ ہوتا۔ غالب شناسوں کے لیے اس کی اہمیت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ ان کی ولادت سے متعلق سابقہ معلومات پر دن کا اضافہ کرتا ہے، لیکن سنہ ہجری میں جو سالِ ولادت تحریر کیا گیا ہے، وہ نہ سابق الذکر تحریر کے مطابق ہے اور نہ بیان کردہ سنہ عیسوی سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ اشکال ایک دوسرے ذریعے سے حل ہو جاتا ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے مطابق اس زائچے کی ایک قدیم تر نقل کلیاتِ نظم فارسی کے اس نسخے میں شامل ہے جو ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں مرتب ہوا تھا اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کے کتب خانے سے بواسطۂ اسٹیٹ لائبریری لوہارو رضا لائبریری رام پور میں منتقل ہوا ہے۔ اس نسخے میں سرنامہ کی منقولہ بالا عبارت الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس طرح نقل ہوئی ہے:

زائچۂ طالع ولادتِ حضرت غالب مدظلہ العالی ہنگام باقی ماندنِ
چہار گھڑی از شب یکشنبہ ہشتم رجب المرجب ۱۲۱۲ ہجری ولادتِ
باسعادت روے دادہ ۱۲۱۲

مولانا عرشی کے بقول اس عبارت میں سالِ ولادت کی اکائی ۲ کا ہندسہ "کسی قدر مشتبہ سا" نظر آتا ہے۔ چونکہ منشی نول کشور نے ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۳ء کے

محولۂ بالا ایڈیشن کے لیے اسی نسخے سے کاپی لکھوائی گئی تھی، اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کاتب نے ۱۲۱۲ھ کو ۱۲۱۳ھ پڑھ کر اسی طرح لکھ دیا اور اس طرح یہ غلطی نسخۂ مطبوعہ میں شامل ہو گئی۔ چونکہ اس نسخے میں یہ زائچہ مخطوطۂ رام پور کی بہ نسبت "مزید نجومی معلومات" کے اضافے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، اس لیے یہ قیاس کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اس میں ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کی مطابقت کے لیے "آغاز ۱۷۹۸ء" کا اندراج نظر ثانی کے وقت کیا گیا ہے اور یہ کسی حساب پر نہیں، صرف اندازے پر مبنی ہے۔

مفصلۂ بالا معلومات جس ترتیب کے ساتھ منظر عام پر آئی ہیں، اب تک ہم نے اسے ملحوظ رکھ کر گفتگو کی ہے۔ اس ترتیب کی بجائے اگر تاریخی تسلسل کا لحاظ رکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ سالِ ولادت سے متعلق اولین اطلاع پر تاریخ اور دن کا اضافہ نسخۂ رام پور میں شامل زائچے کی وساطت سے ۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں ہوا۔ ذی قعدہ ۱۲۷۷ھ مطابق جون ۱۸۶۱ء میں علائی کے نام کے خط میں خود غالب نے تاریخ، مہینے اور سال کی حد تک اس کی توثیق کی اور ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں کلیات نظم فارسی کے پہلے نول کشوری ایڈیشن کے ذریعے یہ تفصیلات منظر عام پر آ گئیں۔

بعد کے زمانے کی ایک اور اہم تحریر جو اس سلسلے میں بطورِ خاص زیر بحث آئی ہے، غالب کے وہ خود نوشت حالات ہیں جو انھوں نے ۱۸۶۴ء میں تذکرۂ "مظہر العجائب" کے لیے قلم بند کیے تھے۔ اس خود نوشت میں حسنِ اتفاق سے اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے، غالب نے ابتدا میں نہ تو اپنے نام اور تخلص کے ساتھ عرف کا تذکرہ کیا تھا اور نہ تاریخ ولادت کا حوالہ دینے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ بعد میں عبارت کے پانچویں لفظ "تخلص" کو نشان زد کر کے اس کے بالمقابل دائیں طرف کے حاشیے پر "مرزا نوشہ" کا اور بائیں جانب پہلی پانچ سطروں کے بالمقابل "سال ولادت ۱۲۱۲ھ" کا اضافہ کیا۔ تیسرے مرحلے میں "سالِ ولادت" اور "۱۲۱۲ھ" کے درمیان قدرے خفی خط میں "۸ رجب" اور لفظ "ہجری" کے بعد "یکشنبہ" لکھا

اضافہ کیا گیا۔ ان تمام بیانات کی روشنی میں غالب کی مکمل تاریخ ولادت صبح یکشنبہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ قرار پائی ہے لیکن اس تاریخ کے قبول کرنے میں ایک قباحت یہ ہے کہ تقویم کے مطابق ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو یکشنبہ کی بجائے چہارشنبہ کا دن تھا مولانا عرشی نے اپنے ایک مضمون میں اس عدم مطابقت کی اس طرح توجیہ فرمائی ہے:

مرزا صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش یکشنبہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بتائی ہے نیز کلیات فارسی میں شائع شدہ زائچے میں اسے آغاز ۱۷۹۸ء کے مطابق کہا ہے از روئے حساب نہ تو ۸ رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے اور نہ یہ تاریخ آغاز ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے۔ مختلف اہل علم نے اس بارے میں مختلف توجیہیں کی ہیں۔ میری دانست میں مرزا صاحب کی تاریخ پیدائش ہشتم نہیں، ہژدہم رجب ہے۔ اس تاریخ کو یکشنبہ بھی تھا اور یہ ۷ جنوری ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے۔ جو بقول غالب آغاز سال قرار دیا جا سکتا ہے۔[۳۵]

تاریخ ہندسوں میں لکھی جائے تو سہو کاتب کی بنا پر ۱۸ کا ۸ رہ جانا بعید از امکان نہیں۔ غالب کے خطوط کے مجموعوں میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں، لیکن ان کی تاریخ ولادت اس عمومی صورت حال سے مستثنیٰ ہے۔ چنانچہ مالک رام صاحب نے عرشی صاحب کی اس قیاس آرائی سے اس لیے بجا طور پر اختلاف کیا ہے کہ غالب نے بیشتر مقامات پر اپنی تاریخ پیدائش الفاظ میں "آٹھویں رجب" یا "رجب کی آٹھویں" لکھی ہے[۳۶] اور کاتب کے تصرف سے ہر جگہ "اٹھارہویں" کا "آٹھویں" ہو جانا کسی طرح قابل یقین نہیں۔ خود مالک رام صاحب کا اس سلسلے میں یہ خیال ہے کہ زائچۂ ولادت میں تاریخ، مہینے اور سنہ کا اندراج غالب کی تحریر کے عین مطابق ہے لیکن دن اور سنہ عیسوی سے متعلق اطلاعات نیر رخشاں نے جو اس زائچے کے ناقل ہیں، اپنی طرف سے اضافہ کی ہیں۔[۳۷] موصوف "مظہر العجائب" کے لیے خود نوشت حالات

میں بھی "۸ رجب" اور لفظ "یکشنبہ" کے اضافہ کو اس بنا پر غالب کی تحریر ماننے سے منکر ہیں کہ ان کے بقول ان کا اندازِ خط اور روشنائی اصل تحریر کے انداز خط اور روشنائی سے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک قوی امکان یہ ہے کہ "یہ الفاظ بطور یادداشت تذکرہ "مظہر العجائب" کے مرتب نے لکھے ہوں" اور اس نے یہ معلومات کلیاتِ نظم فارسی کی ۱۸۶۳ء کی اشاعت سے اخذ کی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے موصوف اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

ہمیں غالب کی تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ہی ماننا پڑے گی جو ان کے خاندان کی روایت ہے۔ اس کے مقابل عیسوی تاریخ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء تھی اور دن چہار شنبہ[۱۵]

اسے مالک رام صاحب کی ذاتی رائے کی حیثیت سے تو قبول کیا جا سکتا ہے لیکن ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ موصوف کا یہ ارشاد کہ "غالب نے بلا مبالغہ بیسیوں جگہ اپنی ولادت کی تاریخ ۸ رجب لکھی ہے"[۱۶] یا یہ فرمانا کہ "غالب نے اپنے اردو اور فارسی خطوں میں اپنی تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ اتنی مرتبہ لکھی ہے کہ ظاہراً کسی شخص کو اس کے بارے میں شبہ نہیں ہونا چاہیے"[۱۷] انتہائی مبالغہ آمیز اور مغالطہ انگیز ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اصل حقیقت واضح کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ غالب نے کتنی جگہ اپنی تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بتائی ہے۔ اور کتنے مقامات پر اس سے اختلاف کیا ہے اور ان کا صحیح سالِ ولادت کیا ہے، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند بنیادی امور کی وضاحت کر دی جائے۔

ان مبادیات کے ضمن میں سب سے پہلی بات ہمیں یہ یاد رکھنا ہو گی کہ غالب اپنے اس اعلان کے باوجود کہ "فقیر میں ہزاروں عیب ہیں، ایک یہ بھی عیب ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا"[۱۸] اور اس دعوے کے باوصف کہ

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

صادق القول ہرگز نہیں تھے اور مصلحت کے حدود سے آگے بڑھ کر صرف بطور تفریح جھوٹ بولنے میں بھی مطلق تامل نہیں کرتے تھے۔ اس لیے ہمیں اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے اس بنیادی حقیقت کا بھی اعتراف کرنا ہوگا قمار خانہ قائم کرنے کے جرم میں غالب کی سزا یابی ایک ہتک آمیز واقعہ اور تاریخی حقیقت ہے۔ اگر اس سزا اور جرمانے کی وجہ سے ان کی شاعرانہ عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا تو یہ تسلیم کر لینے سے بھی کہ جھوٹ بولنا ان کی عادت میں داخل تھا، ان کی قدر و منزلت یقیناً متاثر نہ ہوگی۔ پسندیدہ اشخاص کے عیوب کی پردہ پوشی اہلِ محبت کے مذہب یا باطل پرستوں کے مسلک میں تو جائز ہو سکتی ہے، اہلِ تحقیق بھی اگر اسے گوارا کرتے رہے تو افسانوں کے حقیقت اور حقیقتوں کے افسانہ بنتے رہنے کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

دوسری اہم بات جسے دھیان میں رکھنا ضروری ہے، یہ ہے کہ غالب کا حافظہ انتہائی کمزور اور ناقابلِ اعتبار تھا۔ انھیں مطلق یہ یاد نہ رہتا تھا کہ کسی خاص معاملے میں کچھ دنوں پہلے کسی شخص کو کیا لکھ چکے ہیں، اور آج کسی دوسرے شخص کو کیا لکھ رہے ہیں یا کل کسی شخص سے کسی سلسلے میں کیا کہا تھا اور آج کیا گفتگو کر رہے ہیں۔ ان کے خطوط میں اس قسم کی تضاد بیانیوں کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ مثال کے طور پر حبیب اللہ ذکا کے نام ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں انھوں نے اپنی زندگی کے تین اہم واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا چچا مر گیا،
> ۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا۔

خود غالب کے دوسرے بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چچا کے انتقال کے وقت ان کی عمر نو سال تھی اور کلکتے میں طویل قیام کے بعد وہ ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی واپس پہنچ چکے تھے۔ اسی طرح نواب یوسف علی

خان والیٔ رام پور کی شاگردی کا ذکر انھوں نے اپنے تین خطوں میں کیا ہے اور
یہ تینوں بیانات نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ ان میں سے کوئی بھی
صحیح نہیں۔ مارچ ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں منشی غلام غوث بے خبر کو انھوں نے
اس سلسلے میں یہ اطلاع دی تھی کہ:

> ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والیٔ رام پور
> کہ میرے آشنائے قدیم ہیں ...... میرے شاگرد ہوئے۔

مارچ ۱۸۶۰ء ہی کی ۳۰ تاریخ کو منشی ہر گوپال تفتہ کے نام ایک
خط میں لکھا تھا:

> نواب یوسف علی خاں بہادر تیس بتیس برس سے میرے دوست اور
> پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔

پانچ برس کے بعد ۳۰ جولائی ۱۸۶۵ء کو منشی میاں داد خاں سیاح کے
نام ایک خط میں لکھتے ہیں

> ایک قرن، بارہ برس سے فردوس مکاں یوسف علی خاں والی
> رام پور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے ...... وہ آخر اپریل
> ۱۸۶۵ء حال میں مر گئے۔

ان بیانات کی رو سے غالب اور نواب صاحب کے درمیان استادی و شاگردی کے رشتے
کا قیام بالترتیب ۱۸۵۵ء، ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۳ء کا واقعہ ثابت ہوتا ہے جب
کہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحقیق کے مطابق اصل حقیقت یہ ہے کہ "نواب
فردوس مکان ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو مرزا صاحب کے شاگرد ہوئے تھے۔"

تیسری اہم بات یہ ہے کہ غالب نے اکثر مقامات پر کسی خاص مدت کا تعین
سنہ ہجری کی بنیاد پر کیا ہے۔ جو لوگ اس بنیادی نکتے کو ذہن میں نہیں
رکھتے اور سنہ عیسوی کی بنیاد پر ان کے اقوال کا محاسبہ یا بیانات کی
تاویل کرنے لگتے ہیں، وہ خود بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور دوسروں

کے لیے بھی گمراہی کا راستہ کھول دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر سید بدرالدین کاشف کو غالب نے ایک خط میں یہ اطلاع دی تھی۔

سال گزشتہ کے آغاز میں منشی نول کشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا..... اب سنا ہے کہ چھپ کر تیار ہو گیا ہے.....

یہ خط ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء کو لکھا گیا تھا۔ اس کی عیسوی تاریخ کی بنیاد پر مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ منشی نول کشور نے متذکرہ کلیات ۱۸۶۲ء کے اوائل میں منگا لیا تھا اور مرحوم عتیق صدیقی صاحب نے یکم جنوری ۱۸۶۲ء کے "اودھ اخبار" میں شائع شدہ ایک اشتہار کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا۔

اس خط میں سال گزشتہ یعنی ۱۸۶۲ء غالب نے سہواً لکھا تھا.....

... گمان غالب یہ ہے کہ کلیات کی اشاعت کی بات چیت ۱۸۶۱ء کے وسط سے شروع ہو چکی تھی۔[۱۳]

اگر ان دونوں حضرات نے ہجری تاریخ کی روشنی میں حساب کیا ہوتا تو وہ نہ تو خود غلط فہمی کا شکار ہوتے اور نہ غالب کو سہو کا مرتکب گردانتے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ منشی نول کشور نے کلیاتِ فارسی کا یہ نسخہ غالب کی تحریر کے عین مطابق ۱۲۷۸ھ کے آغاز میں یعنی ۹ جولائی ۱۸۶۱ء کے کچھ دنوں بعد حاصل کر لیا تھا۔

بعض خطوط میں غالب نے اپنی زندگی کے اہم واقعات کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے شروع یا آخر میں تاریخ تحریر درج نہیں ہے۔ بعد میں محققین نے اس مفروضے کی بنیاد پر کہ ان کی تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ہے، ان میں سے کچھ خطوط کا زمانہ متعین کر دیا ہے۔ تحقیقی اعتبار سے اس قسم کی کوئی تحریر موضوع زیر بحث کے سلسلے میں ہمارے لیے کارآمد نہیں ہو سکتی۔ یہ اس سلسلۂ گفتگو کا چوتھا اہم نکتہ ہے۔

پانچواں قابلِ لحاظ نکتہ یہ ہے کہ غالب زائچہ سازی کے فن سے ذاتی طور پر واقف تھے اور ان کا محولۂ بالا زائچۂ ولادت بگمانِ غالب خود انھی کا بنایا ہوا ہے۔ مخطوطۂ رام پور میں شامل زائچے کی بہ نسبت مطبوعہ زائچے میں نجومی معلومات کا اضافہ اس قیاس کو تقویت بخشتا ہے۔ علم نجوم اور زائچہ سازی کے فن سے غالب کی واقفیت کے متعلق ہمارے اس خیال کی ان کے کئی بیانات اور دعووں سے تائید ہوتی ہے مثلاً بہادر شاہ ظفر کی مدح کے ایک قصیدے میں انھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے:

ہم چو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم   نیست در دہر، قلم مدعی و نکتہ گواست

عام حالات میں اس دعوے کو تعلّی سے تعبیر کیا جا سکتا تھا لیکن اس قصیدے میں غالب نے سیّاروں کی رفتار اور ان کے اثرات کا جس ماہرانہ انداز میں تجزیہ کیا ہے، وہ علم نجوم سے ان کی کامل واقفیت پر دلالت کرتا ہے علاوہ بریں حضرت حسین رضؓ کی منقبت کے اس قصیدے کی تشبیب میں بھی جس کے ساتھ زیر بحث زائچہ ملحق ہے غالب نے مصطلحاتِ نجوم کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ نظم کیا ہے اور اپنی زندگی پر مختلف سیّاروں کے اثرات کی پوری عالمانہ دقّتِ نظر کے ساتھ نشاندہی کی ہے کسی فن کی اصطلاحات کا اتنا با معنی استعمال اور ان کی یہ ماہرانہ تشریح و توضیح ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ علم نجوم سے اس دلچسپی اور براہ راست واقفیت کے ثبوت ان کے خطوط اور دوسری تحریروں میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً مولوی نعمان احمد کے نام ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں "قرآن السعدین" کے متعلق لکھتے ہیں:

"زہرہ و مشتری کا ایک برج اور درجہ و دقیقہ میں برابر ہونا "قران السعدین" ہے اور یہ قرانات جزئیہ میں سے ہے اور اکثر واقع ہوتا ہے اور یہ قران موجب سلطنت موعود نہیں۔ اگر کسی بادشاہ کے ہنگامِ ولادت یہ قران آپڑا ہو گا، بہ شرط آں کہ برج طالع میں یا اوتاد یا مائلِ اوتاد میں واقع ہو کہ نظر اس کی طالع مولود پہ ہو تو وہ افادۂ صحت و عشرت کرتا ہے اور بس۔ وہ قرانات اور ہیں جو

موجبِ تغیر او ضاعِ عالم و انتقالِ سلطنت ہوتے ہیں۔ ازاں جملہ ایک یہ قران تھا کہ زحل و مریخ سرطان میں فراہم ہوئے ہیں۔ سراسر ہندستان کی خاک اڑا دی۔"

چنگیز خاں کی تاریخ ولادت مؤرخین نے ۲۰ ذی قعدہ ۵۴۹ھ بتائی ہے اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا طالع میزان تھا اور اس کی ولادت کے وقت ساتوں سیارے برجِ میزان میں جمع ہو گئے تھے۔ غالب نے "مہر نیم روز" میں ان دونوں روایتوں میں عدم مطابقت کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"نامہ نگار پوزش می گسترد وپس از خواستنِ عذرِ درازنفسی ہمی گوید کہ دریں گزارش خطاے رفتہ است ونمی تواند کہ بستم ذی قعدہ کہ ماہے از شہورِ قمری است، مہر و ماہ دریک برج بودہ باشند مگر از ذلقعدہ بست و ہفتم یا بست و ہشتم نہند و اگر ہماں بستم ماہ است، مہر را در میزان و ماہ را در جوزا یا سرطان نشان دہند نہ در میزان۔"[۳۱]

ان شواہد کی روشنی میں بجا طور پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالب زائچہ سازی کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اور اپنا زائچۂ ولادت موجود معلومات یا ذاتی یادداشت کی بنیاد پر انھوں نے خود ہی بنایا ہوگا۔ ایسی صورت میں اس زائچے کے کسی اندراج کو ان کے علاوہ کسی اور شخص سے منسوب کرنا مناسب نہیں۔ صرف یہ دلیل کہ اس کے سرنامے میں ان کا نام "حضرت غالب مدظلہ العالی" لکھا ہوا ہے، اس فیصلے کی بنیاد نہیں بن سکتی کہ اس میں جو غلطیاں ہیں، ان کے ذمے دار اس کے ناقل نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر ہیں۔[۳۲]

یہ زائچہ بظاہر ۱۲۱۲ھ کے برسوں بعد مرتب ہوا ہے۔ چونکہ ان تمام تفصیلات کا جو زائچہ سازی کے لیے بے انتہا ضروری ہیں، پوری باریکیوں اور صحت کے ساتھ زیادہ دنوں تک یاد رہنا بعید از امکان ہے، اس لیے اس میں بعض فنی خامیوں کا باقی رہ جانا بالکل بدیہی امر تھا۔ ان خامیوں کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ جن ماہرینِ علم نجوم نے اس

کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے، ان میں سے جناب صمد حسین رضوی اسے ۱۲۱۱ھ کے مطابق قرار دیتے ہیں[۱۵] اور جناب مسلم ضیائی کے نزدیک اس کے مندرجات سے ۱۲۱۳ھ مستخرج ہوتا ہے[۱۶]۔ اور اگر کسی زائچے میں سنہ ہی مشکوک ہو جائے ہو جائے تو دن یا تاریخ کی صحت کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ مختصر یہ کہ اس زائچے پر خود غالب ہی کا یہ تبصرہ حرف بحرف صادق آتا ہے کہ ؏

مگوے زائچہ کایں نسخہ الیست از اسقام

چھٹی اہم بات یہ ہے کہ زمانۂ ولادت سے متعلق مختلف تفصیلات کی یادداشت کا اگر کوئی ترجیحی یا تقابلی گوشوارہ مرتب کیا جائے تو اس میں مہینے کا نام سرِ فہرست ہوگا، کیونکہ بیشتر مائیں یہ ضرور یاد رکھتی ہیں کہ ان کے کس بچے کی ولادت کس چاند میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد دن، تاریخ اور سال بالترتیب دوسرے تیسرے اور چوتھے نمبر پر جگہ پاتے ہیں۔ مہینے اور دن کے ساتھ تاریخ بھی بہت سی ماؤں کو یاد رہ جاتی ہے۔ لیکن سنہ کا یاد رہ جانا من جملۂ نوادر تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات کہ غالب کی والدہ یا خاندان کی کسی اور بزرگ خاتون نے انھیں ان کا سالِ ولادت اور تاریخ ولادت تو بتائی ہو لیکن یہ نہ بتایا ہو کہ وہ کس دن پیدا ہوئے تھے، بالکل بعید از قیاس ہے۔

ان معروضات کے پس منظر میں خود غالب کے بیانات کی وساطت سے اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے ہمیں دستیاب شواہد کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ پہلے حصے میں وہ تحریریں جگہ پائیں گی جن سے اس معروف روایت کی تائید ہوتی ہے کہ مرزا صاحب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو عالمِ وجود میں تشریف لائے تھے۔ دوسرے حصے میں ان شہادتوں کو جگہ دی جائے گی جو غالب کے اس بیان کی تردید کرتی ہیں اور جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بعض معلوم و نامعلوم اسباب یا مصلحتوں کی بنا پر اپنی عمر گھٹا کر بتاتے رہے ہیں۔

کلیاتِ نظمِ فارسی کے خاتمے، نواب علاء الدین خاں علائی کے نام کے

خط، زائچۂ ولادت اور مختصر خود نوشت کے حوالے سے اس سلسلے میں جو کچھ گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے، اس کے اعادے کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے ۱۲۱۲ھ کے حق میں جانے والی باقی شہادتیں ضروری حوالوں کے ساتھ سطور ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب رجب کے مہینے سے اونہتروال برس شروع ہو گیا ہے۔

(مکتوب بنام علائی مرقومہ یکشنبہ ۱۰ر جنوری ۱۸۶۴ء مطابق ۳۰ر رجب ۱۲۸۰ھ)

(۲) ۱۲۸۲ ہجری شروع ہوئے۔ ۱۲۱۲ھ کی ولادت ہے۔ اب کے رجب کے مہینے سے سترواں (کذا = اکہتروال) سال شروع ہوگا۔

(مکتوب بنام نواب میر غلام بابا خاں مورخہ ۳۱ر مئی ۱۸۶۵ء مطابق ۵ محرم ۱۲۸۲ھ)

(۳) رجب ۱۲۸۲ھ حال کی آٹھویں تاریخ سے اکہتروال سال شروع ہو گیا۔

(مکتوب بنام بے خبر مرقومہ جنوری ۱۸۶۶ء مطابق رمضان ۱۲۸۲ھ)

(۴) اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے بہتروال برس شروع ہو گیا ہے۔

(مکتوب بنام نواب ابراہیم علی خاں وفا مورخہ ۵ر دسمبر ۱۸۶۶ء مطابق ۲۶ر رجب ۱۲۸۳ھ)

(۵) مشہور روایت ہے کہ ایک بار حضرت صاحب عالم مارہروی نے غالب کو لکھا کہ میرا سالِ ولادت لفظ "تاریخ" سے نکلتا ہے۔ جواب میں

غالب نے مزاحاً انھیں یہ شعر لکھ بھیجا:

ہاتفِ غیب شب کو یوں چیخا ان کی "تاریخ" "میرؔ تاریخا"

لفظ "تاریخ" سے ۱۲۱۱ھ اور "تاریخا" سے ۱۲۱۲ھ برآمد ہوتا ہے جو بقول غالب ان کا سالِ ولادت ہے۔

(۶) دستنبو کی تصنیف کا آغاز "دوشنبہ، شانزدہم ماہِ رمضان و یازدہم مئی یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت" یعنی ۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کے کچھ ہی دنوں بعد کا واقعہ ہے۔ اس کے آغاز میں غالب نے لکھا ہے:

امسال سرآغازِ شصت و دومیں سال است کہ دریں کہن خاکداں خاکبازی دازہ پنجاہ سال در ورزشِ شیوۂ سخن جاں گدازی می کنم۔[۱]

(۷) صاحب عالم کے نام ۱۰ ربیع الآخر ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

تریسٹھ برس کی عمر میں بہرا ہو گیا ہوں۔

(۸) منشی نول کشور کو ۱۸ جولائی ۱۸۶۰ء مطابق ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ کے خط میں اطلاع دیتے ہیں:

شصت و پنج سال زیستم و پنجاہ سال سخن گفتم۔

(۹) مولوی احمد حسن عرشی کے نام ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء مطابق ۴ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ کے مکتوب میں رقم طراز ہیں:

۶۵ برس کی عمر ہوئی۔ اضمحلالِ قویٰ، ضعفِ دماغ، فکرِ مرگ، غمِ عقبیٰ، جو آپ مجھے دیکھ گئے ہیں میں اب وہ نہیں ہوں۔

(۱۰) کلیاتِ نظم فارسی مطبوعہ ۱۲۷۹ھ کے خاتمے میں تحریر فرماتے ہیں:

تا امروز کہ از ہجرتِ خاتم الانبیاء علیہ التحیۃ والثناء یک ہزار و دوصد و ہفتاد و ہشت گزشتہ، رصد نگارِ طالع من باندازۂ

خرامشِ پیکِ آسمانی در مشاہدۂ آثارِ سالِ شصت وششم است

(۱۱) جمعہ، ۱۷ محرم ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء کو میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

میاں نے اس چھیاسٹھ برس کی عمر میں شرمساریاں اور رُوسیاہیاں بہت اٹھائی ہیں۔

(۱۲) میر مہدی مجروح ہی کے نام ایک دوسرے خط مورخہ ۸ راگست ۱۸۶۱ء مطابق ۳۰ محرم ۱۲۷۸ھ میں ارشاد فرماتے ہیں:

ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی ہے۔

(۱۳) نواب انوار الدولہ شفق کو ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء مطابق ۱۷ ربیع الآخر کے خط میں لکھتے ہیں:

پانچ برس کی عمر سے ان (اقربائے سببی) کے دام میں گرفتار ہوں۔ اکسٹھ برس ستم اٹھائے ہیں۔

(۱۴) خاتمۂ پنج آہنگ میں رقم طراز ہیں:

دریں روزگار کہ سنینِ ہمایونِ ہجریہ ...... ہزار و دو صد و ہشتاد در شمار آمد ...... دریں شصت[۶۸] و ہشت سالہ زندگی جزو در بازی و کل در سخن طرازی گزشت[۱]۔

(۱۵) قاضی عبدالجلیل جنون بریلوی کے نام ۲۸ جون ۱۸۶۴ء مطابق ۲۳ محرم ۱۲۸۱ھ کے خط میں لکھتے ہیں:

ایک کم ستر برس دنیا میں رہا کوئی کام دین کا نہیں کیا۔

(۱۶) "نامۂ غالب" میں جو اگست ۱۸۶۵ء (ربیع الاول ۱۲۸۲ھ) کے قریب شائع ہوا تھا، ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

ستر برس کی عمر، کانوں سے بہرا، جمعیت کم تفرقہ زیادہ

(۱۷) نواب ابراہیم علی خاں وفاؔ کے نام ۲ اکتوبر ۱۸۶۶ء مطابق ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۳ھ کے خط میں لکھتے ہیں۔

ضعفِ اعضا اور دوامِ مرض سے علاوہ اختلالِ حواس..... یہ اکہتر برس کی عمر کی خوبی ہے۔

(۱۸) ماسٹر پیارے لال دہلوی نے غالبؔ کے فارسی رقعات کا ایک مختصر مجموعہ "نکات و رقعاتِ غالبؔ" کے نام سے فروری ۱۸۶۷ء مطابق شوال ۱۲۸۳ھ میں شائع کیا تھا۔ اس کے آغاز میں غالبؔ نے جو عبارت بطور دیباچہ لکھی ہے، اس میں انھوں نے اپنا تعارف ان الفاظ میں سپردِ قلم کیا ہے:

اکہتر برس کا ناتواں آدمی، دنیا میں عزت اور عقبیٰ میں نجات کا طالب، ترکِ سلجوقی، اسداللہ خاں غالبؔ۔

(۱۹) ہفت روزہ اکمل الاخبار دہلی کے ماہ شوال ۱۲۸۳ھ کے کسی شمارے میں غالبؔ کا ایک اعتذار شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے اپنے احباب اور تلامذہ سے انھیں خطوط کے جوابات اور اصلاحِ کلام کی خدمت سے معاف رکھنے کی درخواست کی تھی۔ ایک مراسلۂ عام میں جس کے ذریعے "دیگر صاحبانِ مطبع اور راقمانِ اخبار" سے اس عبارت کو اپنے اخبار کے اوراق میں درج کرنے کی درخواست کی گئی ہے، اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہفتاد و یک سالہ عمر کی کتاب میں فصلِ آخر کی حقیقت یہ ہے کہ دس پندرہ برس سے ضعفِ سامعہ و قلتِ اشتہا میں مبتلا ہوں اور یہ دونوں علتیں روز افزوں ہیں۔[۱۹]

(۲۰) مولوی سید رحمت علی کی تصنیف "سراج المعرفت" سوم ماہ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۰ھ مطابق دوم فروری ۱۸۵۴ء کو "مطبع سلطانی واقع ارکِ خاقانی" میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ غالبؔ نے اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

"بادشاہ سے کیا عجب ہے کہ دو برس کی تنخواہ دے کر مجھ کو خانۂ خدا

کے طواف کی رخصت دیں کہ یہ گنہگار وہاں جاوے ..... اور اپنے
ستاون برس کے گناہ ...... بخشوا کر پھر آوے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ دیباچہ کتاب کی کتابت و طباعت سے کم و بیش ایک سال قبل یعنی ۱۲۶۹ھ میں لکھا گیا ہوگا تو ستاون برس کی بنیاد پر سالِ ولادت ۱۲۱۲ھ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ان بیس شہادتوں میں سے صرف چار حتمی طور پر ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کی روایت کی توثیق کرتی ہیں۔ پانچویں شہادت دستنبو کی ہے جو بدیہی طور پر اسی زمرے میں شامل ہے۔ باقی پندرہ میں سے تین سے ایک مہینہ چھبیس دن سے دو ماہ اٹھائیس دن تک کی کمی کے ساتھ، پانچ سے چار ماہ چار دن سے چھے ماہ دس دن تک کے تفاوت کو نظر انداز کرنے کے بعد اور سات سے محض قرائن کی بنیاد پر اس روایت کے حق میں ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں حتی الامکان تمام دستیاب شہادتیں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم بعض مآخذ تک نارسائی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر تحقیق کے دائرے کو مزید وسیع کیا جائے تو شاید دو چار ثبوت اور دستیاب ہو جائیں جن سے اس دعوے کو تقویت دی جا سکے کہ ۱۲۱۲ھ ہی اصلاً غالب کا سالِ ولادت ہے۔

غالب کے جو بیانات ان کے اس مشہور قول کے خلاف جاتے ہیں کہ "میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا" ان کا شمار تائیدی شہادتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ان میں سے کم از کم تین تحریروں سے قطعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۱ ہجری تھی۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) قدر بلگرامی کے نام ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲ جمادی الآخر ۱۲۸۰ھ کے خط میں لکھتے ہیں:

"اب کی رجب یعنی ماہ آئندہ کی آٹھویں تاریخ سے ستروان

برس شروع ہوگا"

(۲) قاضی عبدالجمیل جنوںؔ کو بست و ہفتم رجب ۱۲۸۰ھ مطابق ہفتم جنوری ۱۸۶۴ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اس مہینے یعنی رجب ۱۲۸۰ھ سے ستر واں برس شروع اور اسقام و آلام کا شیوع ہے"

(۳) حبیب اللہ ذکاؔ کو مکتوب مورخہ ۲۵ رجب ۱۲۸۳ھ مطابق ۴ دسمبر ۱۸۶۶ء کے ذریعے اطلاع دیتے ہیں۔

"اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے تہتّر واں برس کا شروع ہوا"

ان تین حتمی شہادتوں کے علاوہ جن دوسرے بیانات سے ۱۲۱۱ھ میں ولادت کا ثبوت ملتا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

(۱) "باسٹھ برس کی عمر ہوئی، پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے"
(مکتوب بنام قدر بلگرامی نگاشتہ بست و سوم فروری ۱۸۵۷ء مطابق ۲۸ جمادی الآخر ۱۲۷۳ھ)

(۲) "ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی، اب نجات چاہتا ہوں"
(مکتوب بنام سیاحؔ مورخہ پنجشنبہ ۶ اگست ۱۸۶۳ء مطابق ۲۰ صفر ۱۲۸۰ھ)

(۳) "ایک کم ستر برس کی عمر میری ہوئی۔ سوائے شہرتِ خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا"

(مکتوب بنام حبیب اللہ ذکاؔ مرقومہ چہارشنبہ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۶ اگست ۱۸۶۳ء)

(۴) "ایک کم ستر برس کی عمر ہے۔ کانوں سے بہرا ہو گیا ہوں، بغیر لاٹھی کے چل نہیں سکتا"۔

(مکتوب بنام میر بندہ علی خاں مورخہ ۸ رشعبان ۱۲۸۰ھ

مطابق ۸ا جنوری ۱۸۶۴ء)

(۵) "اکہتّر برس جیا، بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں اور دنوں کی ہے۔ (مکتوب بنام حبیب اللہ ذکا مورخہ جمعہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۸۶۶ء)

(۶) "بہتّر برس کی عمر، حواس مسلوب، قویٰ مضمحل"۔

(مکتوب بنام مولوی نعمان احمد مرقومہ شنبہ ششم اکتوبر ۱۸۶۶ء

مطابق ۲۶ رجمادی الاولیٰ ۱۲۸۳ھ)

(۷) "بہتّر برس کا آدمی پھر رنجور دائمی"۔

(مکتوب بنام سید احمد حسن مودودی مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۶ء مطابق

۸ رجمادی الآخر ۱۲۸۳ھ)

(۸) "آپ سید ہیں اور بزرگ ہیں۔ میرے حق میں دعا کریں کہ اب بہتّر برس سے آگے نہ بڑھوں"

(ایضاً بنام سید احمد حسن مودودی مرقومہ ۳۰ رجولائی ۱۸۶۷ء

مطابق یکم ربیع الاول ۱۲۸۴ھ)

(۹) "ستّر برس کا آدمی، کانوں کا بہرا ہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں"

(خود نوشت برائے تذکرہ مظاہر العجائب نگاشتہ مابین مئی ۱۸۶۴ء

مطابق ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ و دسمبر ۱۸۶۴ء مطابق رجب ۱۲۸۱ھ)

غالب کی جن تحریروں تک ہماری رسائی ہو سکی ہے، ان میں سے کم از کم گیارہ تحریریں ۱۲۱۲ھ اور ۱۲۱۱ھ کی بجائے ۱۲۱۰ھ کے حق میں ثبوت فراہم کرتی ہیں تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) "سنو! میری عمر ستّر برس کی ہے اور تمہارا دادا میرا ہم عمر اور باہم باز تھا"۔

(مکتوب بنام منشی شو نرائن آرام مورخہ ۳ر مئی ۱۸۶۳ء مطابق

۱۴ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ)

(۲) "ستر برس کی عمر، آلام روحانی نہ میں کہوں، نہ کوئی باور کرے۔ امراض جسمانی میں کیا کلام ہے"۔

(مکتوب بنام منشی ہرگوپال تفتہ مورخہ جمعہ ۳ جولائی ۱۸۶۳ء مطابق ۲۶ محرم ۱۲۸۰ھ)

(۳) "ستر برس کی عمر، جتنا خون بدن میں تھا، بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہوکر نکل گیا"۔

(مکتوب بنام قاضی عبدالجمیل جنون مرقومہ دوشنبہ ۱۸ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ مطابق سی ام نومبر ۱۸۶۳ء)

(۴) "آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ سترواں برس مجھے جاتا ہے ہائے!
سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس　　بہت جیوں، تو جیوں اور تین چار برس

(مکتوب بنام تفضل بلگرامی مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۶ جمادی الآخر ۱۲۸۰ھ)

(۵) "سترا، بہترا، اردو میں ترجمہ 'پیر خرف' ہے میری عمر بہتر برس کی ہے پس میں اخرف ہوا"۔

(مکتوب بنام حبیب اللہ ذکا مورخہ جمعہ دہم شوال ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء)

(۶) "چوہتر برس کی عمر ہوئی۔ اگر سن تمیز چودہ برس رکھیے تو ساٹھ برس کا نیک و بد سیاہ و سفید کا تجربہ کار ہوں"۔

(مکتوب بنام محمد حسن خاں ایڈیٹر اخبار دبدبہ سکندری رامپور مورخہ ۵ محرم ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۰ مئی ۱۸۶۷ء)

(۷) "چوہتر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی"۔

(مکتوب بنام سیاح مورخہ ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء مطابق ۲۴ ربیع الآخر ۱۲۸۴ھ)

(۸) قاطع برہان ۱۲۷۶ھ میں مرتب ہوئی تھی۔ غالب نے اس کا سالِ اتمام "درسِ انفاظ" سے نکالا ہے۔ داخلی اور خارجی شواہد کے مطابق یہ اگست ۱۸۵۸ء (محرم ۱۲۷۵ھ) اور اگست ۱۸۵۹ء (محرم ۱۲۷۶ھ) کے درمیان تصنیف ہوئی ہے۔ اس کے آخری صفحات میں غالب نے ایک جگہ اپنے متعلق لکھا ہے کہ "امروز کہ شصت و ششمیں سال از عمر گذلاں حی گذرد، سخن آفریں را سپاس گزارم"۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ چھیاسٹھواں سال ۸ رجب ۱۲۷۵ھ سے شروع ہوا ہو گا۔ اس اعتبار سے یہ بیان بھی ۱۲۱۰ھ کے حق میں ثبوت فراہم کرتا ہے۔

(۹) علائی کے نام یکشنبہ ۱۰ جنوری ۱۸۶۴ء مطابق ۳۰ رجب ۱۲۸۰ھ کے خط میں جہاں غالب نے اپنا سال ولادت ۱۲۱۲ھ بتاتے ہوئے رجب کے مہینے سے انہتر ۶۹ واں برس شروع ہونے کی اطلاع دی ہے وہیں علی بخش خاں متوفی یکم جنوری ۱۸۶۴ء مطابق ۲۱ رجب ۱۲۸۰ھ کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ "مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا..... اس نے ۶۶ برس کی عمر پائی"۔ ۱۲۸۰ھ میں سے چھیاسٹھ برس کم کیے جائیں تو علی بخش خاں کا سالِ ولادت ۱۲۱۴ھ قرار پائے گا۔ چونکہ غالب بقولِ خود ان سے چار برس بڑے تھے، اس لیے ان کی پیدائش ۱۲۱۰ھ کا واقعہ ٹھہرے گی۔

(۱۰) مولوی محمد نجف علی خاں جھجری کی کتاب "سفرنگِ دساتیر" مرزا قربان علی بیگ سالک کے قطعۂ تاریخ کی رو سے ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ غالب نے اس کی تقریظ میں اپنی عمر "ہفتاد سال" بتائی ہے۔ ۱۲۸۰ سے ستر سال گھٹائے جائیں تو ۱۲۱۰ھ حاصل ہو گا۔

(۱۱) مہاراجہ شیو دھیان سنگھ والیِ الور نے "ارژنگِ تجارہ" مصنفہ شیخ محمد مخدوم عالم کے مطابق" بعد بیکنٹھ باشی ہونے مہاراجہ بنے سنگھ بہادر کے ساون

بدی نومیں سمبت ۱۹۱۴ کو سریرِ حکومت راج پر نزول اجلال فرمایا تھا"۔ تقویم یک صد و دو سالہ کی رو سے ساون بدی نومیں سمبت ۱۹۱۴ء، ۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء اور ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ کے مطابق ہے۔ غالب نے مہاراجہ موصوف کی مدح میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کے یہ چار شعر غور طلب ہیں:

آنم کہ چوں بہ مسندِ دولت کنی جلوس — آرم بہ نذر سلکِ گہر ہائے شاہوار
زاں پس کہ گشت گوہرِ من در جہاں یتیم — زاں پس کہ کشتہ شد پدرِ من بکارزار
در پنج سالگی شدہ ام چاکرِ حضور — رنگین سخن طرازم و دیرین وظیفہ خوار
دارم بگوش حلقہ ز پنجاہ و ہشت سال — اکنوں کہ عمر شصت و سہ سال است در شمار

اگر اس قصیدے کو مسندِ دولت پر جلوس یعنی ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ سے کچھ پہلے کی تصنیف مانا جائے تو "شصت و سہ سال" کی بنیاد پر مرزا کا سالِ ولادت ۱۲۱۰ھ قرار پائے گا۔

ایک دو شہادتیں ۱۲۰۹ھ کے حق میں بھی جاتی ہیں لیکن ان میں پس و پیش کی گنجائش ہے، اس لیے چنداں اہم نہیں۔ اصل اہمیت ان شواہد کی ہے جو غالب کی ولادت کو اس سے بھی پہلے کا واقعہ ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً شیخ لطیف احمد بلگرامی کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ "اسی برس کا بوڑھا ہونے آیا ہوں، دعائے مغفرت کا امیدوار ہوں۔" اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں لیکن اس کے یہ جملے کہ "فخرِ ایجاد و تکوین مولانا فضل حق ایسا دوست مر جائے اور غالب نیم مردہ و نیم جاں رہ جائے" بظاہر حال اسے مولانا فضل حق کے زمانۂ وفات یعنی ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کے فوراً بعد کی تحریر ثابت کرتے ہیں۔ اس داخلی شہادت کے پیشِ نظر غالب کے مذکرۂ بالا بیان کی رو سے ان کا سالِ ولادت ۱۱۹۸ھ کے قریب قرار پائے گا۔ لیکن اس بیان پر اگر اس پہلو سے غور کیا جائے کہ غالب نے اصل خط میں اپنی عمر ممکن ہے کہ ہندسوں میں

ستر برس لکھی ہو اور کاتب کی بے احتیاطی کے نتیجے میں ابجد کے کسی مرحلے میں "۷۰" نے جیسے وہ اکثر عربی کی روایت کے مطابق "۷۰" لکھا کرتے تھے، "۸۰" کی شکل اختیار کرلی ہو تو اس کی بنیاد پر یہ مان لینا بعید از عقل نہ ہوگا کہ وہ ۱۲۰۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس قیاس کی تائید متعدد دوسری شہادتوں سے ہوتی ہے۔ لیکن ان شہادتوں کو گنجلک بنانے میں خود غالب نے عادتاً یا سہواً جو کردار ادا کیا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے چند مثالیں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) عبدالصمد کے متعلق جس کا وجود خارجی ایک مستقل موضوع بحث ہے، غالب کا بیان ہے کہ:

"در سال یک ہزار و دو لیست و بیست و شش ہجری بطریق سیاحت به ہند آمد و به اکبرآباد که میگر زیرے فتن و خرد آموختنِ من ہم دراں شہر خجستگی بہر بودہ است، دو سال به کلبهٔ احزانِ من آسودہ است"[۱۱]

نواب کلب علی خاں کے نام ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں اسی معلومات کا اعادہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے[۱۲]

ان بیانات کی روشنی میں اگر یہ مان لیا جائے کہ عبدالصمد کا ورود اکبر آباد ۱۲۲۶ھ کے بالکل آغاز کا واقعہ تھا اور دو سال سے واقعی دو سال یا تقریباً دو سال مراد ہیں تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ غالب کم از کم ۱۲۲۷ھ کے اواخر تک اکبر آباد میں موجود تھے۔ اس کے بعد شادی اور قیام دہلی کے متعلق ان کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے۔

۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں

کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے، پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتکڑیاں اور بڑھا دیں...... سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا، میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا کچھ کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔"

اس بیان سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ غالب کی شادی ۷ رجب ۱۲۲۵ھ (۹ اگست ۱۸۱۰ء) کو یعنی اکبر آباد چھوڑنے کے متذکرہ بالا سنہ سے دو برس پہلے ہو چکی تھی[۲۳] وہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے بعد یعنی ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) ہی سے وہ ایک زندانی کی طرح دہلی میں مقید رہے اور انھیں پہلی بار اس قید سے نکلنے کا موقع اس وقت ملا جب وہ کلکتے کے لیے عازمِ سفر ہوئے اکبر آباد سے ترکِ سکونت کے متعلق اس بیان کو اگر قطعی اور صحیح تسلیم نہ کیا جائے تب بھی حکیم غلام رضا خاں کی اس تحریری شہادت کی روشنی میں کہ "چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب دہلی میں آئے پھر یہیں رہے"[۲۴] ان کے ورودِ دہلی کا سال ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) تسلیم کرنا ہوگا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ بعض دوسری شہادتیں ہمیں ان دونوں بیانات کو قبول کرنے سے روکتی ہیں مثلاً اپنی عائلی زندگی کی بندشوں کا ذکر کرتے ہوئے ۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ء مطابق ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۵ھ کے ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں کہ:-

> اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔

اس خط میں بیان کردہ مدت کے مطابق شادی اور دہلی میں قیام کی ابتدا کا سنہ ۱۲۲۴ھ قرار پائے گا لیکن دہلی میں مستقل قیام کے متعلق دوسرے دو بیانات ۱۲۲۴ھ ۱۲۲۵ھ، اور ۱۲۲۶ھ تینوں کی نفی کرتے ہیں اور اسے مزید کچھ دنوں کے بعد کا واقعہ بتاتے ہیں۔ یہ بیانات علائی کے نام کے دو خطوط سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے خط میں جو

۱۴/اپریل ۱۸۶۱ء مطابق ۲۳/رمضان ۱۲۷۷ھ کو لکھا گیا تھا، غالب کا بیان ہے کہ:۔

"پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں، ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔"

دوسرا خط ۱۶/فروری ۱۸۶۲ء مطابق ۱۶/شعبان ۱۲۷۸ھ کی تحریر ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ

"یہ وہ دلّی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دلّی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔"

ان دونوں خطوں کی رو سے دہلی میں مستقل سکونت کی ابتدا کا زمانہ شعبان، رمضان ۱۲۲۷ھ (اگست، ستمبر ۱۸۱۲ء) قرار پاتا ہے۔ ۱۲۲۷ھ مطابق ۱۸۱۲ء کے اواخر تک اکبر آباد میں موجودگی کے سابق الذکر اندازے اور رمضان ۱۲۲۷ھ/ستمبر ۱۸۱۲ء کے آس پاس دہلی میں آمد کی ان دو شہادتوں کے پیش نظر زیادہ مناسب اور قریب با احتیاط یہی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) ہی کو غالب کے آگرہ سے دہلی نقل وطن کا سال تسلیم کر لیا جائے اس کے بعد مختلف بیانات میں مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے یہ بھی ماننا ہوگا کہ غالب سے سال ولادت اور دوسرے بہت سے اہم واقعات زندگی کی طرح شادی کی تاریخ یا کم از کم سنہ کے بیان میں بھی سہو ہوا ہے۔ چنانچہ اگر ان کا یہ بیان درست ہے کہ شادی کے بعد وہ دہلی سے اس وقت نکلے جب کہ انھیں نکلتے جانے پر مجبور ہونا پڑا تو یہ مانے بغیر بھی چارہ نہ ہوگا کہ ان کی شادی ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) کی بجائے ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں ہوئی تھی۔

۱۲۱۲ھ کو غالب کا سالِ ولادت تسلیم کرنے کے بعد ۱۲۲۵ھ یا حکیم غلام رضا خاں کی شہادت کے مطابق ۱۲۲۶ھ کو ان کے ورودِ دہلی کا سال ماننے سے ان کا ایک اور بیان بھی مانع ہے۔ سہ شنبہ ۱۹/اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں منشی شیو نراین آرام کو لکھتے ہیں:

تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ میرے فرزند دلبند ہو۔۔

میں اور وہ ہم عمر تھے، شاید بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے
ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان
کی، باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی چونکہ
گھر ان کا بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے، چلے جاتے تھے .....
ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جواب لکھمی چند سیٹھ نے مول لے لی ہے۔ اس
کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی .... اس سے
آگے بڑھ کر ایک کٹڑہ کہ وہ گڈریوں والا کہلاتا تھا اور ایک کٹڑہ کشمیرن
والا کہلاتا تھا، اسی کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور
راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔"

راجہ بلوان سنگھ کی آگرے میں آمد اور مستقل بود و باش ان کے والد مہاراجہ چیت
سنگھ کے انتقال کے بعد کا واقعہ ہے۔ مہاراجہ موصوف ۲۹ مارچ ۱۸۱۰ء کو گوالیار میں
فوت ہوئے تھے اور ان کی وفات کے وقت بلوان سنگھ کی عمر گیارہ بارہ سال کے قریب
تھی۔ اس لحاظ سے غالب کا اپنی مبینہ تاریخ شادی یعنی ۱۹ اگست ۱۸۱۰ء سے قبل ان کے
ساتھ پتنگ لڑانا خارج از امکان ہے۔ اس خط کے مندرجات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے
کہ غالب اس وقت تک مستقلاً آگرے ہی میں سکونت پذیر تھے اور ان کی عمر کم از کم انیس
سال ضرور ہو چکی تھی اور آگرے کے قیام کے آخری معلوم سال یعنی ۱۲۲۷ھ میں کم از
کم انیس برس عمر مان لینے کے بعد سال ولادت لازماً ۱۲۰۸ھ ماننا ہوگا۔ اس سنہ میں
ولادت کی تائید جن دوسرے ذرائع سے ہوتی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

(۱) قدر بلگرامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے، اصلاح دینے سے توبہ کی ہے
.... پچھتر برس کی عمر، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں ساٹھ برس کا
نہ مدح کا صلہ ملا، نہ غزل کی داد ...... سب شعرا اور احباب سے
متوقع ہوں کہ مجھے زمرۂ شعرا میں شمار نہ کریں اور اس فن میں مجھ

سے کبھی پرسش نہ ہو۔

اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں لیکن اس کے مندرجات بعینہ اس "اعتذار" کے مشتملات کے مطابق ہیں جو اکمل الاخبار کے ماہ شعبان ۱۲۸۳ھ کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا میاں دادا خاں سیاح کے نام کے ۲۹ اپریل ۱۸۶۷ء مطابق ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ کے ایک خط میں بھی اس اعتذار کا حوالہ موجود ہے، اس لیے قدر کے نام کے اس خط کو بھی اسی زمانے کی تحریر ماننے کے سوا چارہ نہیں، اور ۱۲۸۳ھ میں پچھتر ۷۵ سال کی عمر اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ سال وفات ۱۲۰۸ھ تسلیم کیا جائے۔

(۲) نواب علاء الدین خاں علائی کو یکشنبہ سلخ صفر ۱۲۸۵ھ مطابق ۲۱ جون ۱۸۶۸ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اب جو چار کم اسی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا بلکہ مہینوں کی نہ رہی ...... اپنے دستخط سے یہ توقیع تم کو لکھ دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین ہو۔"

یہ خط غالب نے اپنی وفات سے صرف سات ماہ قبل لکھا تھا اس میں انھوں نے "چار کم اسی برس کی عمر" جس انداز سے بتائی ہے، وہ سوچ سمجھ کر بات کہنے کا انداز ہے اگر ۸ رجب ۱۲۰۸ھ کو بنیاد مان کر حساب کیا جائے تو اس خط کی تحریر کے وقت ان کی عمر چھہتر سال، چھ ماہ تیئیس دن ہوگی۔

(۳) ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں حیدر آباد کے نواب وجیہ الدین خان مفتی اور میر محمد ذکی کے درمیان مادہ مدورہ کے اعداد کے سلسلے میں ایک طویل معارضہ ہوا تھا جس کی روداد "معارضہ مفتی و ذکی" کے نام سے غالباً شائع بھی ہو چکی ہے اس متنازعہ فیہ مسئلے میں جن لوگوں کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی ان میں مرزا غالب بھی شامل تھے غالب کی اس سلسلے کی تحریر مندرجہ ذیل الفاظ پر ختم ہوتی ہے۔

"حضراتِ طرفین بموجب لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا اس پیر ہفتاد و شش سالہ ضعیف الحواس کو معفو فرمائیں۔"[26]

۱۲۸۴ھ میں سے "ہفتاد و شش سال" کی مدت گھٹائی جائے تو ۱۲۰۸ھ حاصل ہوگا۔

ان شواہد کی روشنی میں ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کی بجائے ۸ رجب ۱۲۰۸ھ کو غالب کی تاریخ ولادت تسلیم کرنا زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔ تقویم ہجری و عیسوی کے مطابق اس روز فروری ۱۷۹۴ء کی نویں تاریخ اور یکشنبہ کا دن تھا۔ اس طرح مہینے، دن اور تاریخ کی حد تک غالب کے بیانات کی توثیق ہو جاتی ہے رہا سنہ کا معاملہ تو اس کے متعلق ہمارا تجربہ شاہد ہے کہ غالب نے اپنی زندگی کے بہت سے اہم واقعات کے بیان میں ٹھوکریں کھائی ہیں اس لیے اس سلسلے میں ان کے حافظے پر اعتماد کرنا مناسب نہیں۔

۱۲۰۸ھ کی تائید میں یہاں ایک اور معاصر شہادت کا حوالہ بے محل نہ ہوگا۔ مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں مبدا فیاض سے مرزا کے کسب فیض کے ذکر میں ان کے دو[2] فارسی قصیدوں کے تین شعر نقل کیے ہیں جن میں سے ایک شعر اس طرح منقول ہے۔

ظہور من بجہاں در ہزار و بست[۱۲۲۰] و دو بست

ظہور خسرو و سعدی بہ شش صد و[۶۵۰] پنجاہ

یہ شعر کتاب کی اشاعت اول میں بعینہ اسی طرح شائع ہوا ہے یعنی الفاظ میں بیان شدہ سنین کی تائید و توثیق کے لیے ان کے اوپر ہندسوں میں بھی بالترتیب "۱۲۲۰" اور "۶۵۰" لکھ دیا گیا ہے۔ بعد کے بعض ایڈیشنوں میں یہ التزام موجود نہیں۔ لیکن شعر کا متن اشاعت اول کے عین مطابق ہے۔ اس کے برخلاف "کلیات نظم فارسی" کے نول کشوری ایڈیشن میں پہلے مصرعے کا متن کافی بدلا ہوا ہے۔ اس مجموعے کے مطابق شعر کا مکمل متن حسب ذیل ہے۔

نزول من بجہاں بعد یک ہزار و دو بست ظہور خسرو و سعدی بہ شش صد و پنجاہ

غالب کا ظہور اس شعر کی روایت اول کے مطابق ۱۲۲۰ھ کا اور روایت ثانی کے بموجب ۱۲۰۰ھ کے بعد کا واقعہ قرار پاتا ہے یہ دونوں روایات یکسر بعید از قیاس اور ناقابل قبول ہیں تاہم کسی قدر غور و فکر کے بعد ان کی توجیہ کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ ہمارا

خیال یہ ہے کہ حالی نے یہ شعر کلام غالب کے جس نسخے یا مسودے سے نقل کیا تھا اس میں یہ اس طرح درج ہے۔

ظہورِ من بجہاں در ہزار و ہشت و دو لیست ظہور خسرو و سعدی بہ شش صد و پنجاہ

کتابت یا نقل کے کسی مرحلے پر "ہشت" کا "بیست" یا "لیست" بن جانا بعید از امکان نہیں، چنانچہ قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب نے اس شعر میں اصلاً اپنا سال ولادت "ہزار و ہشت و دولیست" ہی لکھا تھا۔ بعد میں جب انھیں اپنے دوسرے بیانات کا دھیان آیا یا اپنی عمر گھٹانی مقصود ہوئی تو انھوں نے مصرعے کی شکل بدل دی۔ چونکہ یہ مصرع اس بدلی ہوئی شکل میں "کلیاتِ نظم فارسی" کے اس نسخے میں موجود ہے جو ۱۲۵۳ھ میں مرتب ہوا تھا اور جس کے خاتمے میں غالب نے، پہلی بار سنہ کی قید کے ساتھ اپنی عمر کا تعین کیا ہے اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی عمر کے سلسلے میں غلط بیانی یا اس سے متعلق اپنے بیانات کو مسخ کرنے کی ابتدا اسی مصرعے سے کی تھی یہیں سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ جہاں انھوں نے ۱۲۰۸ھ کی بجائے بعد کے کسی سنہ کی بنیاد پر مدتِ عمر کا تعین کیا ہے، وہاں سہواً نہیں بلکہ بالقصد اپنی عمر گھٹا کر بتائی ہے۔ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کی "آغاز ۱۷۹۸ء" کے ساتھ مطابقت بھی ہمارے اس قیاس کی تائید کرتی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سال ہجری اور سال عیسوی کے درمیان دس دن کا فرق ہوتا ہے۔ سنہ ہجری میں سے چار سال گھٹانے کے بعد اسی عام خیال کے تحت سنہ عیسوی میں سے چار سال کے علاوہ دس دن فی سال کے حساب سے چالیس دن کی بھی کمی کر دی گئی۔ تخفیف کے اس قاعدے کے بموجب رجب ۱۲۱۲ھ کی آٹھویں تاریخ ۳۱ دسمبر ۱۷۹۷ء کے مطابق قرار پاتی ہے لیکن فروری ۱۷۹۶ء کے ایک زائد دن کو محسوب کیا جائے تو اسے یکم جنوری ۱۷۹۸ء یعنی "آغاز ۱۷۹۸ء" کے مطابق تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ زائچے کا اندراج ہمارے نزدیک اسی حسابی تخمینے پر مبنی ہے۔

غالب کے سالِ ولادت کے سلسلے میں اپنی اس گفتگو کو اب تک ہم نے بالکلیہ سالِ ہجری کے ساتھ مربوط رکھا ہے لیکن دستیاب شہادتوں میں سے بعض سنہ عیسوی کے اعتبار

سے بھی ہمارے اخذ کردہ نتیجے کی تائید کرتی ہیں۔ اگرچہ یہ تمام شہادتیں گزشتہ مباحث کے ضمن میں پیش کی جا چکی ہیں تاہم اس نئے دعوے کی توثیق کے لیے یہاں ان کا اعادہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے سطور ذیل میں نسبتاً اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) مکتوب بنام آرام مورخہ ۳ر مئی ۱۸۶۳ء "میری عمر ستر برس کی ہے"۔ اگر ۹ر فروری ۱۷۹۴ء کو تاریخ ولادت مان کر حساب کیا جائے تو ۳ر مئی ۱۸۶۳ء کو صحیح عمر انہتر سال، دو ماہ، چوبیس دن قرار پائے گی جسے "ستر برس" کہنا غلط نہیں۔

(۲) مکتوب بنام تفتہ مورخہ ۳ر جولائی ۱۸۶۳ء "ستر برس کی عمر"۔ اصل عمر: انہتر سال، چار ماہ، چوبیس دن۔

(۳) مکتوب بنام صفیر بلگرامی مورخہ ۲۸ر نومبر ۱۸۶۳ء "آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ سترواں برس بھی جاتا ہے"۔ — یہ لیٹے لیٹے حساب کرنے کی بات بہت اہم ہے ہمارے حساب سے اس وقت غالب کی عمر انہتر سال، نو ماہ، انیس دن تھی، اس لیے ان کا کہنا کہ "یہ سترواں برس جاتا ہے" بالکل درست ہے۔

(۴) مکتوب بنام جنونی مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۸۶۳ء: "ستر برس کی عمر"۔ اصل عمر: انہتر سال نو ماہ اکیس دن

(۵) مکتوب بنام ذکا مورخہ ۱۵ر فروری ۱۸۶۷ء: "میری عمر تہتر برس کی ہے"۔ اصل عمر تہتر سال، چھے دن۔

(۶) مکتوب بنام محمد حسن خاں مورخہ ۱۰ر مئی ۱۸۶۷ء "چہتر برس کی عمر ہوئی"۔ اصل عمر: تہتر سال، تین ماہ ایک دن۔

(۷) مکتوب بنام سیاح مورخہ ۲۵ر اگست ۱۸۶۷ء: — "چہتر برس کی عمر"۔ اصل عمر: تہتر سال، چھے ماہ، سولہ دن۔

(۸) قصیدہ درمدح راجہ شیو دھیان سنگھ والی الور میں غالب نے اپنی عمر تریسٹھ سال بتائی ہے۔ ہمارے حساب کے مطابق اس تریسٹھویں سال کی ابتدا ۹ر فروری ۱۸۵۷ء کو ہو چکی تھی اور یہ قصیدہ اسی سال ۱۵ر جولائی سے کچھ پہلے راجہ صاحب

موصوف کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔

(۹) قاطع برہان اگست ۱۸۵۸ء اور اگست ۱۸۵۹ء کے درمیان تصنیف ہوئی۔ اس میں غالب نے لکھا ہے کہ یہ میری عمر کا چھیاسٹھواں سال ہے۔ ہماری طے کردہ تاریخ ولادت کی رو سے یہ چھیاسٹھواں سال ۱۰ ر فروری ۱۸۵۹ء کو شروع ہوا تھا۔

(۱۰) مولوی نجف علی کی کتاب "سفر نگ دساتیر" ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۲۸۰ھ از روئے تقویم ۵ ر جون ۱۸۶۴ء کو ختم ہوتا ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی کتابت و طباعت کے بیشتر مراحل اس تاریخ سے پہلے طے ہو چکے تھے غالب نے اس کی تقریظ میں اپنی عمر "ہفتاد سال" بتائی ہے ہمارے حساب کے بموجب یہ سترواں سال ۹ ر فروری ۱۸۶۳ء کو شروع ہو کر ۸ ر فروری ۱۸۶۴ء کو ختم ہوا تھا۔ یہ تقریظ بظاہر حال اسی درمیانی مدت میں لکھی گئی ہوگی۔

بعض تحریروں میں بیان کردہ مدت عمر پر صحیح حساب کی رو سے چند ماہ کے اضافے کو نظر انداز کر دیا جائے یا صرف سال ولادت ۱۷۹۷ء کو پیش نظر رکھا جائے تو اس نو دریافت عیسوی تاریخ اور سنہ کے حق میں مزید شہادتیں فراہم کی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر غالب نے نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق کو ۲۶ ر مئی ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھا تھا کہ:

"ستر برس کی عمر ہوئی، کہاں تک نہ خرافت آئے۔"

۹ ر فروری ۱۷۹۷ء سے حساب کرنے کی صورت میں ۲۶ مئی ۱۸۶۳ء کو غالب کی عمر ستر برس، تین ماہ، سترہ دن ہوگی جسے، اگر بہت زیادہ احتیاط نہ برتی جائے تو ستر برس کہا جا سکتا ہے۔ تذکرہ "مظہر العجائب" کے لیے خود نوشت کی بھی تقریباً یہی کیفیت ہے اس تحریر میں جو قرائن کے بموجب ۱۸۶۳ء میں مئی اور دسمبر کے درمیان لکھی گئی ہے غالب نے خود کو "ستر برس کا آدمی" کہا ہے۔ یکم مئی کو ان کی عمر ستر سال، دو ماہ، بائیس دن اور یکم دسمبر کو ستر سال، نو ماہ، اکیس دن ہوگی۔

غالب نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ان سے دو

سال چھوٹے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا سال ولادت ۱۲۱۴ھ تسلیم کیا جاتا ہے۔ غالب کی تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۰۸ھ مان لینے کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا دونوں بھائیوں کی عمروں میں فی الواقع دو برس کا فرق تھا یا مرزا یوسف غالب کی معروف تاریخ پیدائش سے دو برس بعد یعنی ۱۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے تھے؟ ہمارے نزدیک امر واقعہ یہی ہے کہ دونوں بھائیوں کے درمیان دو سال کا فرق تھا۔ مرزا یوسف کا انتقال غالب کے بیان کے مطابق ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو ہوا تھا۔ اس لیے چند روز پہلے غالب نے اپنے روزنامچہ غدر (دستنبو) میں ان کے بارے میں لکھا تھا کہ:

"برادر کہ دو سال از من کوچک است، در سی سالگی خرد بباد
داد و دیوانگی و کالیوگی گزید، سی سال است کہ آں دیوانہ کم آزار بے
خروش مست و بے ہوش می زید۔"[۲۸]

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مرزا یوسف کی عمر ساٹھ سال تھی اور وہ تیس برس سے دیوانگی کے عالم میں زندگی گزار رہے تھے اس کی تائید و تصدیق ان کی تکفین و تدفین کے سلسلۂ بیان کے مندرجہ ذیل شعر سے بھی ہوتی ہے:

دریغ آں کہ اندر درنگ ~~سہ~~ ۳×۲۰=۶۰ بیست
سہ ~~دہ~~ ۳×۱۰=۳۰ شاد و ~~سی~~ ۳۰ سال ناشاد زیست[۲۹]

منشی ہر گوپال تفتہ کے نام ۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں بھی غالب نے ضمناً یہ بات دوہرائی ہے کہ "میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا، وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا" تیس برس کی عمر میں دیوانہ ہونے اور تیس [۳۰] برس دیوانگی کے عالم میں گزارنے کے متعلق ان بیانات میں بظاہر کوئی بات قابلِ گرفت نظر نہیں آتی لیکن فی الحقیقت ان کی صحت مشکوک ہے۔ مقدمۂ پنشن کے عرضی دعوے کے ایک اندراج کے مطابق غالب جب نواب احمد بخش خاں کی معیت میں سر چارلس مٹکاف سے ملاقات کی غرض سے بھرت پور گئے تھے تو وہ مرزا یوسف کو بخار اور ہذیان کی حالت میں چھوڑ کر اور چار آدمیوں کو ان کی نگہداشت کے لیے مقرر کر کے اس سفر پر روانہ ہوئے تھے[۳۰]

ہمارے اندازے کے مطابق دہلی سے ان کی یہ روانگی ۲۸ نومبر ۱۸۲۵ء مطابق ۱۶ ربیع الآخر ۱۲۴۱ھ کے آس پاس کا واقعہ ہے[۵۲]۔ اس وقت غالب اپنی بیان کردہ تاریخ ولادت کے مطابق عمر کے انتیسویں برس میں تھے اس لیے مرزا یوسف کی عمر ستائیس برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ غالب کی بڑی بہن چھوٹی خانم کے پوتے سردار الدولہ آغا مرزا بیگ کے بقول مرزا یوسف پر جنون کا یہ حملہ حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں ہوا تھا جہاں وہ "افواج قاہرہ میں نہایت مقتدر عہدے پر سرفراز تھے"[۵۳]۔ اگر حیدر آباد میں ابتدائی علاج اور وہاں سے دہلی منتقل ہونے کے زمانے کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو دیوانگی کے آغاز کا زمانہ ۱۲۴۰ھ متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت سنِ عمر تیس برس ماننے کے بعد سالِ ولادت ۱۲۱۰ھ قرار پائے گا جو ہمارے اندازے کے عین مطابق ہے۔ بظاہر غالب نے اپنی عمر کی مناسبت سے مرزا یوسف کی عمر میں بھی چار سال کی کمی کر کے اسے، اصل مدت میں کمی بیشی کا لحاظ کیے بغیر ہوش مندی و خرد گم کردگی کے دو مساوی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جب کہ اصل واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے تیس سال کے قریب عالمِ ہوش و حواس میں اور تقریباً چونتیس سال دیوانگی کی حالت میں زندگی بسر کی اور انتقال کے وقت ان کی عمر چونسٹھ برس تھی۔

غالب کے سالِ ولادت سے متعلق اس گفتگو کے ضمن میں اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ خود غالب کو دیکھنے یا ان سے قریبی تعلق رکھنے والوں میں بھی بعض ایسے لوگ شامل ہیں جن کے مشاہدے یا معلومات کے مطابق غالب کی عمر اس سے زیادہ تھی جتنی کہ ان کے بیانات سے متعین ہوتی ہے۔ اس قسم کی چند اہم شہادتیں ضروری تفصیل کے ساتھ سطورِ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) مولوی کریم الدین نے اپنے تذکرے "طبقات شعرائے ہند" کے لیے غالب کے حالات ۱۸۴۷ء میں قلمبند کیے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے کہ "عمر ان کی اس سال میں قریب ساٹھ برس کے ہوگی"[۵۴]۔ متداول سالِ ولادت (۱۷۹۷ء) کی رو سے اس وقت غالب عمر کی پچاسویں منزل میں تھے۔

(۲) خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی نے ۱۲۸۰ھ میں لکھنؤ سے کشمیر جاتے

ہوئے دہلی میں مختصر قیام کے دوران غالب سے ملاقات کی تھی۔ اس وقت غالب کی اپنی بیان کردہ تاریخ پیدائش کے مطابق ان کی عمر اڑسٹھ سال تھی لیکن خواجہ صاحب کے بقول وہ "اسّی بیاسی[۸۲] برس کا ضعیف العمر" اور "نحیف الجثہ آدمی" معلوم ہوتے تھے[۳۴]۔

(۳) بہ اعتبارِ زمانہ تیسری اہم شہادت لارنس گزٹ میرٹھ کے کسی نامعلوم الاسم کالم نگار کی ہے۔ جو غالب کے مشہور بنگالی حریف آغا احمد علی کی تصنیف "ہفت آسمان" کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہے۔ آغا صاحب اپنی اس کتاب میں جو سرورق کی ایک تحریر کے مطابق "تحقیق مثنوی و تعریف مثنوی گویان فرس" پر مشتمل ہے، غالب کی بحر سریع مطوی موقوف (مفتعلن، مفتعلن، فاعلن) میں کہی ہوئی چار مختصر مثنویوں کا ذکر کیا ہے اور بغرض تعارف ان کے مختصر حالات بھی تحریر کیے ہیں۔ اسی ضمن میں انھوں نے یہ اطلاع فراہم کی ہے کہ:

> درلارنس گزٹ میرٹھ مطبوعہ ۲۷ فروری ۱۸۶۷ء نوشتہ،
> عمراو تخمیناً ہشتاد و دو سال بودہ است[۳۵]"

اس بیان میں "ہشتاد و دو سال" کی تخصیص اطلاع دینے والے کے اس تیقن کا پتا دیتی ہے کہ اس کے علم یا اندازے کے مطابق اس وقت غالب کی عمر اسّی سال سے برس دو برس زیادہ ہو چکی تھی۔

(۴) خواجہ قمر الدین خاں راقم دہلوی غالب کے شاگرد ہونے کے علاوہ ان کے قریبی عزیز بھی تھے۔ ان کی اہلیہ غالب کے حقیقی بھانجے مرزا عاشور بیگ کی صاحبزادی تھیں۔ موصوف نے سید بہادر حسین انجم نینا پوری کے نام اپنے ایک خط میں ۲۳ دسمبر ۱۹۰۴ء کو جے پور سے یہ اطلاع دی تھی کہ:

> "غالب مغفور کی عمر وقتِ انتقال کچھ کم نوّے برس کی تھی
> چنانچہ ان کی تصویر سے جو نیاز مند نے ان کی آخری عمر میں کھنچوائی تھی۔
> بہ خوبی ثابت ہو جائے گا[۳۶]"

عمر کے بارے میں راقم کا یہ اندازہ یقیناً درست نہیں لیکن اس سے ہمارے اس خیال

کی تائید ضروری ہوتی ہے کہ مرزا کے دیکھنے والوں کے نزدیک ان کی عمر اس سے کہیں زیادہ تھی جتنی کہ وہ خود بتایا کرتے تھے۔

(۵) مولانا حالی نے "یادگار غالب" کے آغاز میں غالب کی تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ہی بتائی ہے لیکن ان کی فراہم کی ہوئی بعض دوسری اطلاعات اس سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ ان میں "ظہور من بہ جہاں در ہزار ولست و دو ولیست" یا "ہزار و ہشت و دو و بست" کے بعد سب سے اہم ان کا یہ بیان ہے کہ:

"مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جب کہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے"[۳۷]

غالب کا ورود کلکتہ خود ان کی تحریر کے مطابق ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ (۲۱ فروری ۱۸۲۸ء) کا واقعہ ہے[۳۸] اگر ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو صحیح مان کر حساب کیا جائے تو اس وقت انھوں نے اپنی عمر کے اکتیس[۳۱] برس مکمل کر کے بتیسویں سال میں قدم رکھا تھا جسے چالیس سے کچھ کم کہنا بعید از قیاس ہے۔ البتہ اگر تعین مدت کے لیے نقطۂ آغاز ۸ رجب ۱۲۰۸ھ مانا جائے تو صحیح عمر پینتیس[۳۵] سال چھبیس دن قرار پائے گی جسے سہو کی تھوڑی سی گنجائش کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ کم چالیس برس کہا جا سکتا ہے۔ مولانا حالی چونکہ غالب کے سفر کلکتہ کے صحیح زمانے سے بے خبر ہیں، اس لیے اس بیان کو ان کے تخمینے کی غلطی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یقین ہے کہ انھیں یہ اطلاع خود غالب سے یا کسی معتبر راوی سے ملی ہو گی

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ غالب کی اصل تاریخ ولادت یکشنبہ ۸ رجب ۱۲۰۸ھ (۹ فروری ۱۷۹۴ء) ہے اور انھوں نے اپنی عمر بالقصد چار سال کم کر کے بتائی ہے، اس پہلو پر غور کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دانستہ غلط بیانی کے محرکات کیا تھے۔ بظاہر اس کا پہلا سبب مقدمۂ پنشن کے سلسلے میں ان کا یہ استدلال معلوم ہوتا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد نواب احمد بخش خاں نے خاندانی پنشن کی تقسیم کے معاملے میں ان کے ساتھ جو ناانصافیاں بلکہ دھاندلیاں کیں، ان کے خلاف وہ اس لیے بر وقت صدائے احتجاج بلند نہ کر سکے کہ اس زمانے میں وہ اور مرزا یوسف دونوں کم سن تھے اور

خاندان میں چند عورتوں اور ان دو کم سن بچوں کے علاوہ کوئی اور موجود نہ تھا۔ یہ بات
اضافۂ پنشن کے لیے اس پہلی درخواست کی ایک اہم شق کی حیثیت رکھتی ہے، جو غالب نے
کلکتہ پہنچنے کے بعد ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء کو مسٹر فریزر کی وساطت سے گورنر جنرل کے حضور
میں پیش کی تھی۔ ہماری معلومات کی حد تک یہ ان کی قدیم ترین دستیاب تحریر ہے
جس میں انھوں نے چچا کے انتقال کے وقت اپنی عمر نو سال اور مرزا یوسف کی عمر
سات سال بتائی ہے۔

دوسرا محرک غالب کا یہ دعویٰ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے عمر کے گیارھویں
برس میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں بھی ان کے بیانات میں خاصا تضاد
موجود ہے۔ ایک جگہ انھوں نے ابتدائے شعر گوئی کی عمر گیارہ برس، دوسری جگہ بارہ
برس، تیسرے موقعے پر چودہ برس، دو مقامات پر پندرہ برس اور ایک مقام پر
سولہ برس بتائی ہے۔ ہمارے نزدیک پندرہ یا سولہ برس کی عمر میں آغازِ مشق کے دعوے میں
گیارہ یا بارہ برس کی عمر میں ابتدائے شعر گوئی کی بہ نسبت مبالغے کی گنجائش کم ہے اس
لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہی زیادہ قرین صحت ہے۔ ۱۲۰۸ھ میں ولادت کی صورت میں اس
بیان کی رو سے مشقِ شعر کی ابتدا کا زمانہ ۱۲۲۳ھ یا ۱۲۲۴ھ قرار پائے گا۔ اس کے
برخلاف اگر گیارہ بارہ سال کی عمر میں آغازِ مشق کے دعوے کو تسلیم کرتے ہوئے ۱۲۱۲ھ
کی بنیاد پر زمانے کا تعین کیا جائے، تب بھی نتیجہ اس سے مختلف نہ ہوگا۔ اختلاف میں
اشتراک کی یہ صورت حال اصل حقیقت سے تجاوز کے اس عمل میں سہو کی بجائے ارادے
کے دخل سے متعلق ہمارے قیاس کو تقویت بخشتی ہے۔ یہیں سے یہ اندازہ کیا جا سکتا
ہے کہ غالب کے بیانات میں جو تضادات ملتے ہیں، وہ صرف اتفاقی نہیں، ارادی
بھی ہیں اور ان سے سرسری گزر جانا ہمیں بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا کر سکتا ہے۔

حواشی

(۱) کتب خانۂ خدا بخش، پٹنہ میں غالبؔ کے کلیات نظم فارسی کے دو قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ ان میں سے پہلا نسخہ (HL No 593) غالبؔ کے دوست رائے چھجمل کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی کتابت ۱۱ ربیع الآخر ۱۲۵۴ھ کو مکمل ہوئی ہے۔ دوسرا نسخہ (HL No 24 ک ا) "حسب الارشاد جناب مستطاب نواب معلیٰ القاب محمد مصطفیٰ خاں بہادر" ۱۵ ذی قعدہ ۱۲۵۷ھ کو لکھ کر مکمل کیا گیا ہے اور مرزا غالبؔ کی "نظرِ اکسیر اثر" سے گزر چکا ہے۔ ان دونوں نسخوں میں خاتمے کی یہ عبارت بعینہٖ اسی طرح موجود ہے۔

(۲) بحوالہ ماہ نامہ "ماہ نو" کراچی، شمارہ جنوری، فروری ۱۹۶۹ء ص ۵۴

(۳) ماہ نامہ "آج کل" شمارہ ماہ جولائی ۱۹۶۹ء ص ۳ بحوالہ "فسانۂ غالبؔ" از مالک رام مطبوعہ ۱۹۷۷ء ص ۲۹۔

(۴) فسانۂ غالبؔ، ص ۳۰

(۵) ایضاً ص ۲۷

(۶) ایضاً ص ۳۰

(۷) عیارِ غالبؔ، مرتبہ مالک رام ص ۳

(۸) فسانۂ غالبؔ، ص ۲۵

(۹) مکتوب بنام مولوی نعمان احمد مورخہ ۶ اکتوبر ۱۸۶۶ء

(۱۰) مکاتیب غالبؔ، مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی، طبع دوم (۱۹۴۳ء) ص ۴۷

(۱۱) مجلہ "صحیفہ" لاہور، غالبؔ نمبر (حصہ اول) جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۱۴۹

(۱۲) مجلہ "غالبؔ نامہ" نئی دہلی، جلد اول، شمارہ ۳، ۴، ص ۲۲

(۱۳) مہر نیم روز، طبع اول (۱۲۷۱ھ) ص ۸۶، بحوالہ "غالبؔ نامہ" شمارہ جنوری

۱۹۸۴ء ص ۱۴۴

(۱۴) فسانۂ غالب، ص ۲۶

(۱۵) مضمون مشمولہ "عیار غالب" ص ۱۲۵ تا ۱۶۹

(۱۶) مضمون مشمولہ سہ ماہی "اردو" کراچی، غالب نمبر (جلد اول) شمارہ جنوری فروری، مارچ ۱۹۶۹ء ص ۱۰ تا ۴۸

(۱۷) دستنبو، شائع کردہ صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی (فروری ۱۹۶۹ء) ص ۱۹۔

(۱۸) اس عبارت میں "جُزو" سے سولہ سال اور "کل" سے پچاس سال مراد ہیں غالب نے اپنی عمر اڑسٹھ سال بتاتے ہوئے اس کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ "جزو" یعنی سولہ سال کھیل کود میں اور "کل" یعنی ۵۰ سال سخن درازی میں بسر ہوئے اور دو سال سے پچاس برس کی اس مشقِ سخن کے نتائج کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ جاری ہے۔

(۱۹) خطوط غالب، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر طبع لاہور، بار دوم (۱۹۶۲ء) ص ۶۱۸

(۲۰) قاطع برہان و رسائل متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود ص ۱۴۹

(۲۱) ایضاً ص ۱۵

(۲۲) مکاتیب غالب، طبع دوم، ص ۶۰

(۲۳) غالب کے سوانح نگاران کی شادی کی تاریخ عام طور پر ۷ رجب لکھتے آئے ہیں "اردوئے معلّٰی" میں شامل علائی کے نام کے محوّلہ خط میں بھی یہی تاریخ منقول ہے لیکن "عودِ ہندی" کی قدیم اشاعتوں (مطبع مجتبائی میرٹھ طبع ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء ص ۶۹ مطبع نول کشور کانپور طبع اول ۱۸۷۸ء، طبع دوم ۱۸۸۱ء و طبع سوم ۱۸۸۷ء) میں صاف طور پر ۱۷ رجب درج ہے اصل خط سے بھی جو لاہور میوزیم میں محفوظ ہے، عودِ ہندی کے اندراج یعنی ۱۷ رجب کی تائید ہوتی ہے (بحوالہ "خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ" از کاظم علی خاں، مطبوعہ ۱۹۸۱ء ص ۲۰۹، ۲۱۰) اس خط کی تاریخ تحریر شنبہ، ۸ رجون ۱۸۶۱ء (۲۸ ذی قعدہ، ۱۲۷۷ھ) ہے۔

شادی کی معروف تاریخ کے سلسلے میں مالک رام صاحب کے ایک بیان کا حوالہ بےمحل نہ ہوگا۔ موصوف عرشی صاحب کی تجویز کردہ تاریخ ولادت "شہر دہم رجب"[18] کے رد میں ۸ رجب کی صحت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ غالب کے بزرگوں کو "اس (تاریخ) پر اس حد تک اصرار تھا کہ انھوں نے غالب کی زندگی کے ایک اور اہم واقعے (شادی) کو اس سے وابستہ کر دیا۔" اس کے بعد ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ "اگر ۸ رجب کو ان کی زندگی کے تیرہ برس پورے نہیں ہوئے تھے تو اور کون سی بات ان کی شادی کی تاریخ مقرر کرنے کا باعث ہوئی" (فسانۂ غالب ص ۳۰) اس انکشاف کے بعد کہ خود غالب کی تحریر کے مطابق ان کی شادی ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو ہوئی تھی، اس استدلال کی کمزوری از خود واضح ہو جاتی ہے۔

(۲۴) مکتوب بنام پروفیسر عبدالغفور شہباز مصنف "زندگانیِ بے نظیر" بحوالہ "فسانۂ غالب" ص ۱۷۔

(۲۵) تاریخ بنارس، جلد اول، ص ۷۰۵، خم خانۂ جاوید از لالہ سری رام، جلد سوم ص ۲۹۹ و غالب نامہ نئی دہلی، شمارہ جنوری ۱۹۸۳ء (مضمون کاظم علی خاں بہ عنوان تصویرِ شعرا)

(۲۶) عکس تحریر مشمولہ "تحقیقی نوادر" از ڈاکٹر اکبر حیدری مطبوعہ ۱۹۷۴ء مقابل ص ۳۶۰

(۲۷) یادگارِ غالب، طبع اول بحوالہ عکسی ایڈیشن، شائع کردہ اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ (۱۹۸۲ء) ص ۱۳۔

(۲۸) دستنبو، طبع فروری ۱۹۶۹ء، ص ۲۰

(۲۹) ایضاً ص ۲۷

(۳۰) فسانۂ غالب، ص ۱۱۱

(۳۱) تفصیلات کے لیے دیکھیے راقم السطور کا مضمون "غالب کا سفر کلکتہ" مشمولہ "غالب نامہ" شمارہ جنوری ۱۹۸۱ء و "استدراک" مشمولہ "غالب نامہ"

شمارہ جولائی ۱۹۸۱ء

(۳۲) فسانۂ غالب ص ۳۹

(۳۳) "طبقات شعرائے ہند" شائع کردہ اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ (۱۹۸۳ء) ص ۳۷۸

(۳۴) بحوالہ "احوال غالب" مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین آرزو، ص ۵۴

(۳۵) ہفت آسمان، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۳ء، ص ۱۶۲

(۳۶) بحوالہ "احوال غالب" ص ۲۳۱، ۲۳۲

(۳۷) یادگار غالب، عکسی ایڈیشن ۱۹۸۲ء ص ۱۸

(۳۸) "نامہ ہائے فارسی غالب" مرتبہ سید اکبر علی ترمذی، ص ۲۶

(۳۹) بحوالہ "فسانۂ غالب" ص ۱۰۸

(۴۰) ابتدائے شعر گوئی کے زمانے کے سلسلے میں غالب کے مختلف بیانات حسب ذیل ہیں:

(۱) "از روزے کہ شمارہ سنین عمر از آحاد فراتر رفت و رشتۂ حیات زحمت یازدہمیں گرہ بخود برگرفت، اندیشہ درروا روگام فراخ برداشت وگرپوہ دمغاکِ بادیۂ سخن پیمودن آغاز نہاد" (خاتمۂ کلیات نظم فارسی طبع ۱۸۹۳ء ص ۵۵۳ و ۵۵۴)

(۲) "بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر میں کاغذ مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ یا سٹھ [۶۲] برس کی عمر ہوئی، پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔" (مکتوب بنام قدر بلگرامی نگاشتہ بست و سوم فروری ۱۸۵۷ء)

(۳) "در چہاردہ سالگی از آموزگار پرورش یافتم و پنجاہ و دو سال مغز سخن کا فتم امروز شصت و ششمیں سال از عمر گزراں می گزرد" (قاطع برہان و رسائل متعلقہ مرتبہ قاضی عبدالودود، ص ۱۴۹)

(۴) "پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا، دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا" (مکتوب بنام عبدالرزاق شاکر مرقومہ بجواب خط ...

۱۱۱۸۱

یکم اگست ۱۸۶۵ء)

(۵) پچھتر برس کی عمر۔ پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس لکا نہ مدح کا صلہ ملا نہ غزل کی داد" (مکتوب بنام قدر بلگرامی تاریخ ندارد)

(۶) "دریں شصت و ہشت سالہ زندگی کہ جزو در بازی و کل در سخن طرازی گذشت و بسا گزیں روشہا در نثر نظر فروز آمد، از دو سال در بندِ آں بودہ ام کہ نگاشتہ ہائے گذشتہ را بہر شیوہ ربایاں فراہم آورم" (خاتمہ "پنج آہنگ"، کلیاتِ نثرِ غالب، طبع ۱۸۶۸ء ص ۲۵۴)

اس آخری بیان میں غالباً "جزو" و "کل" کی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مدت مشق میں ایک سال کی کمی گوارا کر لی گئی ہے۔ اس لیے اسے بھی پندرہ سال کی عمر میں آغاز شعر گوئی سے متعلق گذشتہ دو بیانات سے مختلف نہ سمجھنا چاہیے۔ ایک اور بیان سے جس میں کہا گیا ہے کہ "در دہ سالگی آثار موزونی طبع پیدائی گرفت" (پنج آہنگ ص ۲۴۹) بعض حضرات نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غالب دس سال کی عمر ہی میں شعر کہنے لگے تھے لیکن "آثارِ موزونیٔ طبع کا پیدا ہو جانا باقاعدہ مشقِ شعر پر ہرگز دلالت نہیں کرتا۔ یوں بھی گیارہ برس اور دس برس کے درمیان فرق کی نوعیت سولہ برس اور پندرہ برس کے درمیانی تفاوت سے زیادہ مختلف نہیں۔

(مجلہ "غالب نامہ" دہلی، شمارہ جنوری ۱۹۸۵ء)

غالب کا سفرِ کلکتہ

غالب کا سفرِ کلکتہ ان کی زندگی کے چند اہم ترین واقعات میں سے ہے لیکن آج تک ان کے سوانح نگار اس سفر کی تفصیلات کے سلسلے میں کسی متفقہ نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس عدم اتفاق کا اصل سبب خود غالب کے وہ مبہم بیانات ہیں جو ان کے اصل مخاطبین کے لیے وضاحت طلب نہ تھے لیکن بعد کے قارئین کے لیے عقدہ ہائے لاینحل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اختلاف کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان واقعات کی تفصیل میں خود غالب نے مختلف مواقع پر مختلف قسم کی باتیں کہی ہیں اور جس سوانح نگار کو جو نیا نکتہ ہاتھ آگیا ہے اس نے اس کی ایک نئی تعبیر و تفسیر پیش کر کے اپنے طور پر ایک مختلف فیہ نتیجہ اخذ کر لیا ہے۔ اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی بالعموم نظر انداز کیا جاتا رہا ہے کہ غالب صداقت شعار اور قابلِ اعتبار راوی نہیں۔ ان سے جہاں اپنی زندگی کے بعض اہم واقعات کے بیان میں محض سہو و نسیان کی بنا پر غلطیاں ہوئی ہیں وہیں انھوں نے بعض مواقع پر مصلحت اور موقع شناسی کے تحت دیدہ و دانستہ غلط بیانی اور افسانہ طرازی سے بھی کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سفر کے آغاز سے قبل اور اثنائے سفر میں جو اہم واقعات پیش آئے انھیں صحیح تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی بجائے محض قیاسات اور اندازوں کا سہارا لیا گیا ہے اور یہ قیاس آرائیاں اکثر غلط نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہیں۔

ہم کو یہ معلوم ہے کہ غالب کا یہ سفر اپنی خاندانی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں تھا۔ ان کو یہ پنشن نواب احمد بخش خاں والیِ فیروز پور جھرکہ کے خزانے

سے ملتی تھی۔ غالب کا یہ خیال تھا کہ نواب صاحب نے انگریز حکام کی مرضی اور منشا کے خلاف اپنے طور پر خواجہ حاجی کو ان کے چچا نصراللہ بیگ کے وارثوں میں شامل کر کے ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے اور اس طرح انھیں اور ان کے دیگر اعزّہ کو ایک بڑی رقم سے غلط طور پر محروم کر دیا ہے۔ اپنے بیان کے مطابق غالب کلکتہ روانہ ہونے سے قبل اس حق تلفی کے خلاف برابر احتجاج کرتے اور نواب صاحب کو اس کی تلافی کی طرف متوجہ کرتے رہے تھے۔ خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد بھی جب نواب صاحب نے اپنے وعدے کے مطابق غالب اور ان کے دیگر افراد خاندان کو پوری تنخواہ ادا نہیں کی تو وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں فیروز پور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے نواب صاحب نے اس موقع پر اپنی بعض مجبوریوں اور جنرل اختر لونی (ریزیڈنٹ دہلی) سے تعلقات کی ناخوشگواری کا عذر پیش کر کے انھیں حالات کے سازگار ہونے تک مزید چند روز تحمل سے کام لینے پر آمادہ کر لیا اور وہ بے نیل مرام دہلی واپس چلے آئے اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد جنرل اختر لونی کا انتقال ہو گیا (۱۵ جولائی ۱۸۲۵ء) اور ان کی جگہ سر چارلس مٹکاف کے تقرر کی خبر موصول ہوئی۔ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات جو اس سفر سے متعلق بعض اہم امور کے تعین میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں، مقدمہ پنشن کے عرضی دعوے کے حوالے سے خود غالب کی زبان میں بالتفصیل سطور ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

"سر چارلس مٹکاف کے آنے کے بعد بھرت پور کا معاملہ پیش آ گیا اور وہ راجہ بھرت پور کو بچانے اور راج کے شورہ پشتوں کو سزا دینے میں مصروف ہو گئے۔ چوں کہ نواب احمد بخش خاں بھی وہاں جا رہے تھے، انھوں نے ساتھ چلنے کو کہا۔

میں اس زمانے میں اپنے بھائی کی بیماری کی وجہ سے ایک مصیبت میں گرفتار تھا۔ مزید برآں قرض خواہوں کے تقاضوں سے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا اس لیے میں اس سفر کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا۔ اس کے باوجود اس توقع پر کہ مجھے مٹکاف صاحب کی خدمت میں سلام کرنے کا موقع مل جائے گا، میں نے اپنے بھائی کو بخار اور ہذیان کی حالت

میں چھوڑا اور چار آدمیوں کو اس کی نگہداشت کے لیے مقرر کیا۔ کچھ قرض خواہوں کو
طرح طرح کے وعدوں سے چپ کرایا، دوسروں کی نظروں سے چوری چھپے، بھیس بدل کر
کسی طرح کا ساز و سامان لیے بغیر سو مشکلوں سے میں نواب احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور
کے لیے روانہ ہو گیا۔ میرے بار بار کہنے کے باوجود نواب احمد بخش خاں نے سر چارلس
سے متعارف نہ کرایا۔ اس اثنا میں نواب صاحب کے منہ پر لقوہ ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد
ڈاکٹر ڈنکن کے علاج سے وہ ٹھیک ہو گئے اور فیروز پور واپس چلے آئے۔ حالانکہ سر
چارلس مٹکاف بھی تین دن وہاں فیروز پور میں رہے اور میں ان سے بھی روزانہ نواب احمد بخش خاں سے
درخواست کرتا رہا، انھوں نے مجھے سر چارلس کی خدمت میں پیش نہیں کیا۔

جب مٹکاف صاحب بہادر دلی واپس چلے گئے، تو اب میں نواب احمد بخش خاں سے بالکل
مایوس ہو گیا۔ پھر میں نے دل میں خیال کیا کہ انصاف پسند حکمراں اپنے متعلقین میں سے ہر ایک
کا خیال رکھتے ہیں۔ آخر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں ان کا وسیلہ اور واسطہ تلاش کروں کیوں
نہ کسی تیسرے آدمی کے بغیر میں خود ہی سر چارلس مٹکاف کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے تمام احوال
شروع سے لے کر آخر تک ان کے گوش گزار کر دوں! لیکن قرض خواہوں کے شور و غوغا کے ڈر
سے میرا دلی جانا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اپنی عزت کا خیال آیا اور میں نے ارادہ ترک کر دیا۔

اس کے علاوہ انھی دنوں نواب گورنر جنرل بہادر کے ورود کی خبر پھیلی۔ یقین تھا کہ
سر چارلس مٹکاف بھی ان کی پذیرائی اور استقبال کے لیے ضرور جائیں گے۔ لہٰذا میں
نے فیصلہ کیا کہ کانپور جاؤں اور وہاں سے ان کی معیت میں واپس آؤں اور راستے
میں کسی مناسب موقع پر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مصیبت اور قرض کی ساری
رام کہانی ان سے کہوں اور انصاف کا طالب ہوں۔

غرض میں اسی ارادے سے فرخ آباد اور کانپور کی طرف روانہ ہو گیا۔ بد قسمتی
سے جوں ہی کانپور پہنچا میں وہاں بیمار پڑ گیا۔ یہاں تک کہ ہلنے چلنے تک کی سکت بھی جاتی
رہی۔ چونکہ اس شہر میں کوئی ڈھنگ کا معالج نہ ملا، مجھے مجبوراً ایک کرائے کی پالکی میں گنگا
پار لکھنؤ جانا پڑا۔ یہاں میں پانچ مہینے سے کچھ اوپر بستر پر پڑا رہا۔ یہیں میں نے نواب

گورنر جنرل بہادر کے ورود اور بادشاہ اودھ کے ان کے استقبال کو جانے کی خبر سنی لیکن ان دنوں میں چارپائی سے اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ لکھنؤ کی آب و ہوا بالکل میرے راس نہیں آئی۔

میرے بزرگوں کے اور نواب ذوالفقار علی بہادر (باندہ) کے باہمی پرانے تعلقات تھے...... اس لیے میں جوں توں کرکے گرتا پڑتا باندہ (بندیل کھنڈ) پہنچ گیا۔ یہاں میں تقریباً چھ مہینے تک نواب صاحب کے مکان پر رہا۔ خدا کے کرم اور نواب صاحب کی ہمدردی اور تیمارداری اور توجہ سے مجھے اس خطرناک بیماری سے نجات ملی۔

اب بارشیں ختم ہو چکی تھیں اور نواب گورنر جنرل بہادر بھی کلکتے مراجعت فرما چکے تھے۔ میں فیروزپور سے تو دلی جا نہیں سکا تھا۔ اب باندے سے کیسے اور کیونکر اس کی جرأت کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے خیال کیا کہ آخر دلی اور کلکتہ دونوں جگہ قانون تو وہی ایک ہے مجھے سارا معاملہ حکومت کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے۔ چونکہ کشتی سے سفر کرنے کی میری مقدرت نہیں تھی، مجھے مجبوراً خشکی کے راستے گھوڑے کی سواری سے کلکتہ جانا پڑا۔ دو تین ملازم میرے ساتھ تھے لیکن میں بہت کمزور اور تھکا ماندہ تھا۔ زادِ راہ اور کوئی آسائش کا سامان بھی نہیں تھا۔

مرشد آباد پہنچا تو یہاں مجھے نواب احمد بخش خاں کی رحلت اور شمس الدین احمد خاں کی جانشینی کی خبر ملی۔ چونکہ میرا دعویٰ احمد بخش خاں کی جاگیر سے متعلق تھا، میں نے سوچا وہ زندہ ہوں یا مردہ اس سے میرے معاملے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور کلکتے پہنچ گیا[5]۔"

غالب کی بیان کردہ اس روداد سفر کی بعض اہم شقوں پر بحث سے قبل اگر ان سوالات کے جواب تلاش کر لیے جائیں کہ چارلس مٹکاف کا ریذیڈنٹ کے عہدے پر تقرر کب عمل میں آیا؟ وہ دہلی کس تاریخ کو پہنچے؟ بھرت پوری کی مہم پر کب روانہ ہوئے؟ اس مہم سے فراغت کے بعد کب دہلی واپس ہوئے؟ نواب گورنر جنرل کے ورود کی خبر کب عام ہوئی؟ وہ کس تاریخ کو کانپور میں وارد ہوئے اور بادشاہ

اودھ کو کب ان کی خدمت میں باریابی حاصل ہوئی؟ تو بہت سے اختلافی مسائل ازخود حل ہو جائیں گے۔

جان ولیم کاے (J.W. KAYE) کی "دی لائف اینڈ کرسپانڈنس آف چارلس لارڈ مٹکاف" (THE LIFE AND CORRESPONDENCE OF CHARLES LORD METCALFE.) جلد اول سے معلوم ہوتا ہے کہ مٹکاف کو ۲۶ اگست ۱۸۲۵ء کو دہلی کا رزیڈنٹ اور سول کمشنر اور گورنر جنرل کا ایجنٹ برائے راجپوتانہ مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۸۲۵ء کو وہ کلکتے سے دہلی پہنچے۔ نومبر کے اوائل میں فصیل شہر کے باہر ان کے خیمے نصب ہوئے اور اس کے ساتھ بھرت پور پر فوج کشی کے لیے تیاری کا آغاز ہوا۔ ۶ دسمبر ۱۸۲۵ء کو یہ قافلہ متھرا پہنچا۔ ۱۰ دسمبر کو قلعہ بھرت پور کا محاصرہ ہوا اور ۱۸ دسمبر کو یہ معرکہ سر کر لیا گیا۔ اس کے بعد مٹکاف ریاست کے نظم و نسق کی بحالی میں مصروف رہے۔ حتیٰ کہ موسم کی تبدیلی اور گرم ہواؤں کے زور نے انھیں دہلی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ ("THE SETTING IN OF HOT WINDS CERTAINLY COMPELLED HIS RETURN TO THE IMPERIAL CITY)

دہلی پہنچنے کے بعد وہ یہاں کے انتظامی امور کی نگرانی اور اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ برسات کا موسم شروع ہوتے ہی انھوں نے دوبارہ راجپوتانہ کے دورے کا آغاز کیا اور اس دورے سے واپس آنے کے بعد گورنر جنرل کے استقبال کی تیاریوں میں منہمک ہو گئے۔

رولرز آف انڈیا سیریز (RULERS OF INDIA SERIES) کی تصنیف "ارل ایمہرسٹ" (EARL AMHERST) کی ورق گردانی سے اس سلسلے کے جو واقعات سامنے آتے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ لارڈ ایمہرسٹ ۴ اگست ۱۸۲۶ء کو اپنے متعلقین و ملازمین خاص کے ساتھ کلکتے سے شمالی ہند کے دورے پر روانہ ہوئے۔ مختلف مقامات پر مختصر قیام اور سیر و تفریح کرتا ہوا یہ قافلہ ۱۸ نومبر ۱۸۲۶ء کو کانپور پہونچا جہاں گورنر جنرل کا استقبال کیا گیا۔ ۲۰ نومبر کو شاہ اودھ (غازی الدین حیدر) مع بائیس افراد خاندان کے ان کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ دوسرے دن گورنر جنرل بازدید کی غرض سے شاہ اودھ

کے خیمے میں تشریف لے گئے۔ اس کے بعد یہ قافلہ فتح گنج، لکھنؤ، سورون، آگرہ، فتحپور سیکری ڈیگ، کوسی اور فیروز پور جھرکہ ہوتا ہوا دہلی میں وارد ہوا۔ مارچ کا مہینہ دہلی میں گزارنے کے بعد شملہ کی طرف روانگی عمل میں آئی۔ ۱۵ جون کو شملے سے روانہ ہو کر انبالہ ہوتے ہوئے ۲ جولائی کو میرٹھ پہنچے۔ میرٹھ میں چند روز قیام کے بعد کلکتے کی طرف مراجعت کے لیے سفر کا آغاز ہوا۔

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب نواب احمد بخش خاں کی معیت میں نومبر ۱۸۲۵ء کے اواخر میں دہلی سے بھرت پور روانہ ہوئے ہوں گے[۲] اور مٹکاف کی بھرت پور سے دہلی کی طرف واپسی گرمی کا موسم شروع ہو جانے کے بعد بگمان غالب اپریل ۱۸۲۶ء کے اواخر میں عمل میں آئی ہو گی۔ غالب اس وقت فیروز پور میں موجود تھے۔ چونکہ وہ نواب صاحب کی جانب سے قطعاً مایوس ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے سوچا کہ دہلی جا کر اپنے معاملات خود مٹکاف کے گوش گزار کریں لیکن قرض خواہوں کے شور و غوغا کے ڈر سے وہ ایسا نہ کر سکے اور بدستور فیروز پور میں مقیم رہے یہاں تک کہ برسات کا موسم (جون کا مہینہ) شروع ہو گیا اور مٹکاف دہلی سے راجپوتانہ کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ اسی زمانے میں گورنر جنرل (لارڈ ایمہرسٹ) کے ورود کی خبر عام ہوئی اور مٹکاف نے اپنا دورہ مکمل کر کے ان کے خیر مقدم کی تیاریاں شروع کر دیں۔ گورنر جنرل کی کلکتہ سے روانگی ۱۴ اگست ۱۸۲۶ء کو عمل میں آئی۔ یقین ہے کہ ان کے سفر سے متعلق اطلاعات اس کے بعد ہی فیروز پور پہنچی ہوں گی۔ واقعات کی اس رفتار کے پیش نظر ہمارا اندازہ یہ ہے کہ غالب اگست ۱۸۲۶ء تک بہر حال فیروز پور میں موجود تھے۔ فیروز پور سے مولانا فضل حق کے نام انھوں نے صنعت تعلیل میں جو خط لکھا تھا[۳]، اس سے ان کے ذہنی انتشار کا اندازہ ضرور ہوتا ہے لیکن فیروز پور میں قیام کی مدت کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا، البتہ رائے چھجمل کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مدت خاصی طویل تھی۔ نواب احمد بخش خاں اس اثنا میں الور کے معاملات میں الجھے رہنے کی وجہ سے کافی دنوں تک فیروز پور سے غیر حاضر رہے تھے اور غالب نے ان کی معاودت کے انتظار میں تنہائی کے یہ دن انتہائی کرب اور اذیت کے عالم میں گزارے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"ہر قدر می جوشم کہ دامن ہمت آوارگی بہ کمر بزنم، دست قدرت زیر سنگ آمدہ است ...... چارۂ رنج بے دلی معدوم و پایان کارہا نامعلوم۔ پیداست کہ از قفس جستہ بدام افتادہ را چہ حال خواہد بود ..... جلاے وطن و عزم سفر و آلام غربت مصیبتے است کہ نصیب ہیچ آفریدہ مباد ..... ہر چند در وطن نیم امّا قرب وطن نیز قیامت است ہنوز با اہل کاشانہ راہِ نامہ و پیام واست ہر چہ دیدہ می شد، آشوب چشم بود و ہر چہ شنیدہ می شود، زحمتِ گوش است۔ نیم جانے کہ از آں ورطہ بیروں آوردہ ام، مگر ودیعت خاکِ فیروزپور ست کہ مرا ایں ہمہ اقامتِ اضطراری افتادہ و مرگے کہ نعش بہ ہزار آرزو از خدا می خواہم مگر در ہمیں زمین موعود ست کہ ایں قدر درنگ در افتادگی ہا رو داد۔ ہر چہ از اخبارِ معاودتِ نواب شنیدہ می شود، راہیچ حرفِ مدعائے من ندارد۔ چہ سر بسر آں افسانہ نکبت الوریاں و آرائشِ صفوفِ قتال و واژگوں گشتنِ کارہاے اعدا و درست آمدنِ فالِ خیر سگالان دولتِ فخریہ است۔ کلمہ مختصے کہ نواب صاحب۔ درینقدر عرصہ رونق افزاے فیروزپور خواہند گشت، از کسے شنیدہ نمی شود و دلِ مضطر تسلی نمی پذیرد ...... طاقتِ ستم کشی سپری گشت و انتظار از حد گزشت بہ روے ماتم کہ در کارزار ..... پالیس زخم کاری برداشتہ باشد کہ اگر گریزد نیارد و گر بخت و اگر خود را بر جاے وارد نتواند ایستادن"

(کلیاتِ نثرِ غالب ص ۱۵۵، ۱۵۶)

ان حالات میں ستمبر ۱۸۲۶ء سے قبل فیروزپور سے کلکتہ کے لیے غالب کی روانگی خارج از امکان نظر آتی ہے فیروزپور سے براہ فرخ آباد کانپور تک کی مسافت اندازاً ایک ماہ میں طے ہوئی ہو گی، وہ لارڈ ایمہرسٹ کے کانپور میں ورود (۱۸ نومبر ۱۸۲۶ء) سے قبل بہر حال وہاں پہنچ چکے تھے۔ ابتدا میں چونکہ کانپور تک کا سفر ان کے پیشِ نظر تھا اس لیے اغلب ہے یقیناً گورنر جنرل کی آمد کی امکانی تاریخ کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کر لی ہو گی۔ محتاط طور پر یہ قیاس

کیا جا سکتا ہے کہ وہ اکتوبر کے مہینے میں وہاں پہنچے ہوں گے، کان پور پہنچتے ہی وہ سخت بیمار ہو گئے اور بغرضِ علاج لکھنؤ جانے پر مجبور ہوئے۔ ۲۰ نومبر ۱۸۲۶ء کو بادشاہِ اودھ کی گورنر جنرل کے حضور میں باریابی کے وقت وہ لکھنؤ میں مقیم اور صاحبِ فراش تھے لکھنؤ میں غالب کا قیام پنجشنبہ ۲۵ ذی قعدہ (۱۲۴۲ھ) مطابق ۲۱ جون ۱۸۲۷ء تک رہا۔ جمعہ ۲۶ ذی قعدہ (۱۲۴۲ھ) مطابق ۲۲ جون ۱۸۲۷ء کو وہ وہاں سے روانہ ہوئے اور چوتھے روز یعنی ۲۹ ذی قعدہ مطابق ۲۵ جون کو کانپور پہنچے۔ رائے چھج مل کو لکھتے ہیں :-

"بتاریخ بست و ششم ذی قعدہ روزِ جمعہ ازاں ستم آباد (لکھنؤ) برآمدم و بتاریخ بست و نہم در دار السرور کان پور رسیدم"۔

(کلیاتِ نثر ص ۱۵۸)

غالب نے مقدمۂ پنشن کے عرضی دعوے میں جس کا اقتباس گذشتہ سطور میں پیش کیا جا چکا ہے لکھنؤ میں پانچ مہینے سے کچھ اوپر بستر پر پڑے رہنے کا ذکر کیا ہے، لیکن ابن حسن خاں کے نام ایک خط میں لکھنؤ میں قیام کی مجموعی مدت "کما بیش پنج ماہ" بتائی ہے۔ یہ خط "مہر نیمروز" کی اشاعت (۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۳ء) کے بعد کسی وقت لکھا گیا تھا، گویا سفر لکھنؤ سے کم از کم ستائیس برس بعد کی تحریر ہے۔ چونکہ اتنے زمانے تک اس سفر سے متعلق تمام واقعات اور تاریخوں کا پوری صحت کے ساتھ غالب کے ذہن میں محفوظ رہنا بہ ظاہر بعید از امکان ہے اسلئے اس مندرجات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک عرضی دعوے کا تعلق ہے، اس کی بنیاد پر بھی صرف مدت علالت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ لکھنؤ میں قیام یقیناً اس سے زیادہ عرصے تک رہا۔ ہمارے اندازے کے مطابق یہ مدت تقریباً آٹھ ماہ (اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر ۱۸۲۶ء تا ۲۱ جون ۱۸۲۷ء) قرار پاتی ہے۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر اکبر حیدری کا خیال یہ ہے کہ غالب اواخر ذی الحجہ ۱۲۴۱ھ (جولائی ۱۸۲۶ء) سے ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ (۲۱ جون ۱۸۲۷ء) تک تقریباً گیارہ ماہ لکھنؤ میں قیام پذیر رہے[۵] جناب کاظم علی خاں نے اپنے ایک مضمون میں یہ مدت پندرہ ماہ کے قریب (شعبان المعظم

(۴ ۱۲ھ تا ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ) قرار دی ہے[56] گزشتہ سطور میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ فیروز پور سے غالب کی روانگی گورنر جنرل کے ورود کی خبر عام ہونے اور ۱۸۲۶ء کا موسم برسات ختم ہونے کے بعد کا واقعہ ہے، اس لیے قیاسات کی ان غلطیوں پر کسی مزید بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی البتہ غلط فہمی کے اس سر چشمے کی نشاندہی ضروری ہے جس سے یہ غلط نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

لکھنؤ پہنچنے کے بعد غالب نے سبحان علی خاں، میر نیاز حسین خاں اور بعض دوسرے "دوستانِ جدید" کے ایما سے معتمد الدولہ آغا میر کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ایک عرض داشت تحریر کی تھی[57] "کلیاتِ نثر غالب" میں اس عرض داشت کے اختتام پر تاریخ تحریر "دوم محرم الحرام" لکھی ہوئی ہے۔ اسے دوم محرم الحرام ۱۲۴۲ھ) مطابق ۶ اگست ۱۸۲۶ء) مان کر یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ غالب اس تاریخ سے قبل لکھنؤ پہنچ چکے تھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کا یہ اندراج مذکورہ عرضداشت سے قطعاً غیر متعلق اور بعد کا اضافہ ہے۔ "گل رعنا" کے ایک قلمی نسخے (ملکوکہ خواجہ محمد حسن (لاہور) میں یہ عرضداشت "محرر دعاگو محمد اسد اللہ" پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ نسخہ غالب کے ایک معاصر عزت اللہ دہلوی نے خود مصنف کے نسخے سے نقل کیا تھا اور اس کی کتابت ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۵۲ھ (۲۶ فروری ۱۸۳۷ء) کو مکمل ہوئی تھی[58]۔ "نامہ ہائے فارسی غالب" کے قلمی نسخے میں جو الحاق و تصرف کے امکانات سے بڑی حد تک پاک ہے، یہ آخری الفاظ بھی موجود نہیں۔ "دوم محرم الحرام" کا اضافہ کس زمانے میں کیا جانا قرین قیاس ہے، یہ بحث آگے آئے گی، یہاں اس طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہ یا تو اس اختلافِ نسخ سے بے خبر رہے ہیں یا عدم اعتنا کی بنا پر اسے نظر انداز کر گئے ہیں۔

یہ مسئلہ بھی اب تک طے نہیں ہو سکا ہے کہ قیام لکھنؤ کے زمانے میں غالب نے غازی الدین حیدر کی مدح میں کوئی قصیدہ کہا تھا یا نہیں۔ مولانا غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ اس قیام کے دوران انھوں نے شاہ اودھ کے لیے کوئی قصیدہ نہیں کہا تھا[59] مالک رام صاحب

کا ارشاد ہے کہ انھوں نے غازی الدین حیدر کے لیے قصیدہ تو کہا تھا مگر وہ اسے نامکمل ہونے کے باعث وزیرِ اعظم آغا میر کی خدمت میں پیش نہ کر سکے تھے[۱۰] ان دو راویوں کے برخلاف کاظم علی خاں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "غالب نے ۴ اگست ۱۸۲۶ء (مطابق ۲۱ محرم ۱۲۴۲ھ) تک شاہ اودھ غازی الدین حیدر کے لیے ایک قصیدہ کہہ کر راجا صاحب رام کے وکیل اور سبحان علی خاں کے ذریعے وزیر اودھ آغا میر کے پاس بھیجا تھا نیز اس قصیدے کے صلے سے سفر کلکتہ کے لیے زادِ راہ فراہم کرنا چاہتے تھے[۱۱]

مختلف شہادتوں کا ان کے صحیح تاریخی پس منظر میں جائزہ لینے کے بعد ان تینوں دعووں میں مولانا غلام رسول مہر کا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن یہ خیال کہ غالب نے اس زمانے میں مطلقاً کوئی قصیدہ نہیں کہا تھا درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ آغا میر کی مدح میں ایک سو دس شعر کا قصیدہ کہہ کر اسے ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے مناسب وقت کے منتظر تھے، لیکن عرضداشت وزیر موصوف کی خدمت میں گزرنے کے بعد باریابی کے لیے جو شرائط قرار پائیں، وہ ان کے لیے ناقابلِ قبول تھیں، اس لیے یہ قصیدہ پیش نہیں کیا جا سکا۔ کلکتہ پہنچنے کے بعد مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کے نام پہلے ہی خط میں لکھتے ہیں:-

"قصیدہ کہ در مدح آغا میر گفتہ ام، خدای داند کہ برای خاندانِ من طرفہ داغ بدنامی است و لطف ایں کہ آں یک صد و دہ شعر از صفحہ حک ساختن نمی توانم۔ چوں نواب مرشد آباد نیز سید زادہ است می خواہم کہ) ایں قصیدہ را بنام وے شہرت دہم ...... توقع کہ تا زمانے کہ اشعار موضح اسم ممدوح را ...... (حک نہ کنند) ...... آں قصیدہ را بہ کس نہ نمایند"

(نامہ ہائے فارسی غالب ص ۲۹)

رائے چھج مل کے نام کے ایک خط سے جو ان کے "مہربانی نامہ تقدر رقم" موصولہ "پنجم ذی قعدہ روزِ آدینہ" (یکم جون ۱۸۲۷ء) کے جواب میں لکھا گیا تھا، یہ اندازہ ہوتا ہے

کہ غالب اس وقت تک آغا میر تک رسائی کے لیے اپنی کوششوں کی طرف سے پرامید تھے چنانچہ ان کو لکھتے ہیں کہ "انشاء اللہ العظیم ہم دریں ہفتہ حوالۂ چناں کہ دل می خواہد، از نوکِ خامہ بیرون تراویدنی ست" (کلیاتِ نثر ص ۱۵۶) لیکن نتیجہ ان کی توقعات کے برخلاف نکلا اور وہ انتہائی مایوسی اور کبیدہ خاطری کے عالم میں لکھنؤ سے کانپور کی طرف چل پڑے کانپور پہنچنے کے بعد انھوں نے رائے صاحب موصوف کو جو خط لکھا ہے وہ امیدوں کے طلسم کی اس شکست اور اس کے نتیجے میں ایک قسم کی جھلاہٹ اور مایوسی و آزردہ طبعی کے اثرات کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس خط میں انھوں نے جہاں اپنے بعض مخلص و مشفق دوستوں کا گرم جوشی کا فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے، وہیں آغا میر کے خلاف اپنے دل کا غبار نکالنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے:-

"در زمانے کہ بمیقۂ سامی درود یافت، متردد بین السفر والاقامت بودم و سرِ آں داشتم کہ اگر نقشِ مدعا رسا نشیند و ہوس تنگ وقوع گزیند، بے تامل مکتوبے حاوی طلب رقم کنم۔ امّا ہنگامۂ بازی ہائے خیال برہم خورد و بختِ رمیدہ یاوری نہ کرد۔ مبادیِ مقدمہ سراسر طرازِ دلبری داشت لیکن در اواسط کار بہنجار نہ بود۔ منت ایزد را کہ اواخر تا دیدہ ماند ورنہ چہا بایستے دید۔ خلاصۂ گفتگو ایں کہ اعیانِ سرکارِ لکھنؤ بامن گرم جوشیدند، انچہ در بابِ ملازمت قرار یافت، خلافِ آئین خویشتن داری و ننگِ شیوۂ خاکساری بود۔ تفصیلِ ایں اجمال و توضیح ایں ابہام جز بہ تقریر ادا نتواں کرد و از وفورِ بے ربطی آں را بدام تحریر نتواں آورد کوتاہی سخن ہر چہ دراں بلاد از کرم پیشگی و فیض رسانیِ ایں گدا طبع سلطان صورت یعنی معتمد الدولہ آغا میر شنیدہ می شد، بجز اکہ حال برعکس است۔ در ابتدائے دولت ہر کرا آلتِ حصولِ مدعائے خود دید، بمروئے بپیچید۔ لاجرم یک دو کس بہر رنگ متمتع گشتند واکنوں کہ از استحکامِ اساسِ دولت خود خاطرش جمع است، در بندِ جمع زر افتادہ است

جملہ خاندان ہائے قدیم لکھنؤ از بیداد ایں بے رحم بسیلاب فنا رسیدہ و ناز پروردگان ایں دیار آوارہ جہاتِ گیتی گردیدہ واو خود از تردستی و اسرافِ خود پشیماں شدہ از یں شیوہ برگشتہ تر گردیدہ۔ بالجملہ بازارِ بیداد گرم است۔ مہاجنان و ساہوکاران، و تاجران پنہاں زر و مالِ خود بکان پوری رسانند و ایمن نیند۔ ہر کہ بود گریخت و ہر کہ ہست در بندِ گریختن ست۔"

(کلیات نثر غالب ص ۱۵۷، ۱۵۸)

آغا میر کی خدمت میں باریابی سے غالب کا مدّعا درحقیقت کلکتے کے سفر کے لیے زادِ راہ کی فراہمی کے سوا کچھ اور نہ تھا لیکن محض اس کوشش کی کامیابی کی امید پر تقریباً ایک سال تک پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا ان کی مزاجی کیفیت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ آغا میر کی طرف سے مایوسی کے بعد انھوں نے جس شدید ردِّ عمل کا اظہار کیا ہے، اس کے پیشِ نظر بھی عرضداشت کی مبینہ تاریخِ تحریر (۲ محرم) سے ۱۶ ذی قعدہ تک ان کا "متردد بین السفر والاقامت" رہنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ تسلیم کر لینا کہ انھوں نے مذکورہ عرضداشت ۲ محرم ۱۲۴۲ھ کو تحریر کی ہوگی، درست نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف قوی امکان یہ ہے کہ یہ عرضداشت بیماری سے صحت یابی کے بعد اپریل یا مئی ۱۸۲۷ء میں لکھی گئی ہوگی عرضداشت موسومہ آغا میر کو ۲ محرم کی تحریر مان لینے اور اس کے ذکر کو ایک دوسری عرضداشت کے حوالوں کے ساتھ مخلوط کر دینے کے نتیجے میں ایک عجیب قسم کا خلطِ مبحث پیدا ہو گیا ہے چنانچہ جناب کاظم علی خاں لکھتے ہیں کہ بیماری سے افاقہ ہونے پر غالب نے ۴ اگست ۱۸۲۶ء کے آس پاس راجا صاحب رام کے وکیل کو مندرجہ ذیل تین چیزیں بھیجی تھیں:۔

(۱) وزیرِ اودھ آغا میر کے لیے ایک عرضداشت

(۲) شاہِ اودھ نواب غازی الدین حیدر کے لیے ایک قصیدہ

(۳) سبحان علی خاں کے لیے ایک خط۔ گمانِ غالب ہے کہ یہ خط بھی ۴ اگست ۱۸۲۶ء کے قریب لکھا گیا ہوگا۔[۳۱]

کاظم علی خاں صاحب کا یہ خیال یکسر غلط فہمی پر مبنی ہے اور انھوں نے اس کے اظہار میں بے احتیاطی سے کام لے کر دوسروں کے لیے بھی اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا سامان کر دیا ہے۔ موصوف نے غالبؔ کے جس خط کے حوالے سے یہ تمام باتیں تحریر کی ہیں، اس میں نہ غازی الدین حیدر کا نام آیا ہے اور نہ آغا میر کا۔ منشی محمد حسن خاں کے نام کے اس خط کے بعض مفید مطلب حصّے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

"پیش ازیں نامہ بنام خان والا شان، سبحان علی خاں و عرضداشتے بحضور والائے حضرت وزارت پناہی با یک قصیدۂ مدحیۂ شاہ رقم کردہ مجموعۂ اوراق پیش وکیل راجہ صاحب اشفاق مناقب راجہ صاحب رام صاحب فرستادہ ام و آں خواستہ ام کہ آں نگارستانِ آرزوے محال بہ نظر خان صاحبِ عالی مناصب گذشتہ بحضرتِ دستورِ اعظم رسد۔ بود کہ ایں قصیدہ بر بزم خسروی خواندہ شود و نامہ نگار از مائدۂ جودِ خسروی ..... زلہ بر بندد تا امروز کہ اربعین کامل گذشت، ہیچ گونہ ازاں نیرنگ وافسوں اثرے پدیدار نہ گشت ...... امروز کہ چار شنبہ ہیژدہم ماہ صیام است و شبے کہ بقاعدۂ اہلِ تنجیم شب چار شنبہ و بہ لسانِ شرع شب پنجشنبہ نامیدہ شود، رسیدہ خار خیال درد دل ایں آشوب انگیخت کہ بہ راجہ صاحب رام صاحب عرض کردہ شود کہ بہ لکھنؤ وکیل خود را نویسند تا آں نامہ وآں عرضداشت کہ در نوردِ آں قصیدہ آبستنی ست، بوالا خدمت شما برساند ذوقِ آرزو طلبی آں چناں بیتابم کرد کہ تا بامداد شکیبا نتوانستم بود، بہ شب نامہ نگاشتم و ہم بہ شب بہ خدمتِ راجہ صاحب فرستادم۔"

(کلیاتِ نثر غالب ص ۱۷۵)

یہاں اصل موضوع کی طرف آنے سے قبل یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ سبحان علی خاں غالبؔ کے ان "دوستانِ جدید" میں سے تھے جو لکھنؤ میں ان کے ہم صحبت

ذہن نشین تھے اس لیے لکھنؤ میں موجودگی کے دوران انھیں یکے بعد دیگرے دو شخصوں
کی وساطت سے مخاطب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جس
وقت یہ خط لکھا گیا ہے، اس وقت غالب اور راجہ صاحب رام دونوں دہلی میں موجود
تھے گویا یہ تمام خط وکتابت غالب کے قیامِ دہلی کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے اور حقیقتاً دربار
اودھ سے حصول مدعا کی ایک نئی کوشش سے متعلق ہے۔ غالب نے جو قصیدہ مع ایک
عرضداشت اور خط کے سبحان علی خاں تک پہنچانے کے لیے راجا صاحب رام کے
وکیل کے پاس لکھنؤ روانہ کیا تھا اور جسے بعد میں منشی محمد حسن خاں کی معرفت
"دستورِ اعظم" کی خدمت میں پیش کرنا مناسب سمجھا، وہ دراصل نصیر الدین حیدر اور ان کے
وزیر روشن الدولہ کی مدح میں تھا۔ مرزا تفتہ کے نام دوشنبہ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کے ایک خط
میں انھوں نے اس سلسلے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن
الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا۔ اسی دن پانچ ہزار روپیہ
بھیجنے کا حکم ہوا متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ
مرحوم لکھنؤ سے آگئے، انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا...... میں نے
شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کرکے لکھو کہ میرے قصیدے پر
کیا گزری انھوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار ملے۔ تین ہزار روشن الدولہ
نے کھائے، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیئے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب
جانو، غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ اگر نہ بھیجا ہو
تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپیے بھی نہیں پہنچے۔ اس
کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو، اس کا مضمون یہ ہو کہ
میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ
وہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا
میں کرناسخ ہوں، اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر ان کا کھایا ہوا روپیہ

ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی یہ خط میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا تیسرے دن شہر میں خبر اُڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا"۔

(خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر مطبوعہ لاہور طبع ثالث ص ۱۹۴)

موجودہ معلومات کے مطابق آغا میر سے مایوس ہونے کے بعد دوبارہ دربار اودھ سے استمداد کے لیے غالب کی کوششوں کا آغاز پچیس[۲۵] اشعار کے اس تہنیتی قطعے سے ہوتا ہے جو "تاریخ طوئی کتخدائی بادشاہِ اودھ" کے عنوان سے ان کے کلیاتِ نظمِ فارسی میں شامل ہے ہجری و عیسوی مادہ ہائے تاریخ کے بموجب یہ قطعہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں لکھا گیا تھا۔ اسی سال "روزِ تولد جناب امیر علیہ السلام" یعنی رجب کی تیرہویں تاریخ (۱۵ نومبر ۱۸۳۴ء) کو نصیر الدین حیدر کی دوسری شادی ہوئی تھی۔ ناسخ کے نام سہ شنبہ ۱۸ صفر ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۶ جون ۱۸۳۵ء کو لکھے ہوئے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قطعے کو مناسب قدردانی کی امید کے ساتھ حضورِ شاہ میں پیش کرنے کی غرض سے غالب نے سبحان علی خان کی دوستی کا سہارا لیا تھا، لیکن عرض داشت موسومہ آغا میر کی طرح ان کی یہ کوشش بھی جس ناکامی سے دوچار ہوئی، اس کا اندازہ اس خط کے ان مندرجات سے کیا جا سکتا ہے۔

"آنچہ در باب پاسخ مکتوب من بزبان گہر فشانِ سبحان علی خاں رقم پذیرفتہ است نہ چناں است بلکہ حق آن است کہ خانِ والا شان بہ گم نامان پرداخت والتفات بہ خاکساران ننگِ پایۂ خود شناخت ورنہ بشرطِ تامل پنہاں نمی تواند ماند کہ مقصودِ من ہمہ آں بود کہ قطعہ بنظرِ بندگانِ خسروِ سپہر آستان گذرد و نتیجہ از خاکساری و بے اعتباری من گفتہ شود پیداست خود ایں قدر دشوار نبود"۔

(کلیاتِ نثرِ غالب ص ۱۶۲، ۱۶۳)

گمان غالب یہ ہے کہ بے اتفاقی کے اس مظاہرے اور زمانۂ قیام لکھنؤ کے مایوس کن تجربے کا خیال آنے کے بعد ہی کسی وقت غالب نے شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا ہوگا کہ انھوں نے دربار اودھ سے کاربر آری کے لیے ایک بار پھر سبحان علی کا سہارا لے کر غلطی کی ہے اور اسی کشمکش کے عالم میں انھوں نے بعجلت تمام منشی محمد حسن خاں کے نام وہ خط لکھا ہوگا جس کا اقتباس سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے۔ ان حالات میں چہارشنبہ کے دن کسی انگریزی مہینے کی اٹھارہ تاریخ کو لکھا ہوا یہ خط ۱۶ جون ۱۸۳۵ء کے بعد کی تحریر قرار پاتا ہے۔ بعد کے اس زمانے میں نصیر الدین حیدر (متوفی ۳ ربیع الآخر ۱۲۵۳ھ مطابق ۷ جولائی ۱۸۳۷ء) کے باقی ماندہ دو سالہ دورِ حکمرانی میں صرف تین مہینے نومبر ۱۸۳۵ء، مئی ۱۸۳۶ء اور جنوری ۱۸۳۷ء ایسے آتے ہیں جن کی اٹھارہ تاریخ چہارشنبہ کے دن واقع ہوئی تھی۔ تقویم ہجری و عیسوی کے مطابق ۱۸ نومبر ۱۸۳۵ء کو رجب ۱۲۵۱ھ کی ستائیسویں، ۱۸ مئی ۱۸۳۶ء کو صفر ۱۲۵۲ھ کی پہلی اور ۱۸ جنوری ۱۸۳۷ء کو شوال ۱۲۵۲ھ کی دسویں تاریخ تھی۔ چونکہ مدحیہ قصائد سلاطین و نوابین کی خدمت میں عموماً عیدین یا اسی قسم کے خوشی کے دوسرے مواقع پر پیش کیے جاتے تھے، اس لیے عین ممکن ہے کہ یہ قصیدہ جشن عید الفطر کے موقع پر حضور شاہ میں پیش کرنے کی غرض سے ماہ رمضان المبارک ۱۲۵۲ھ میں سبحان علی خاں کو بھیجا گیا ہو۔ ان تمام واقعات کا نصیر الدین حیدر کی وفات سے متصل زمانے میں پیش آنا بھی بظاہر اسی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو زیر بحث خط کی تاریخ تحریر ۱۸ جنوری ۱۸۳۷ء اور قصیدے کی روانگی کی تاریخ ۱۰ دسمبر ۱۸۳۶ء قرار پائے گی۔ خط کا آغاز غالب نے اس جملے سے کیا ہے "شبا ہنگام است و من بادل تر ند پیشِ چراغے کہ نورش از حجرہ بایوان نمی رسد، نگارش ایں ارادت نامہ پیش گرفتہ ام۔" اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ خط ایسے زمانے میں لکھا گیا ہے جب کہ سردی اپنے شباب پر تھی اور کہرے کی وجہ سے چراغ کی روشنی کا حجرے سے ایوان تک پہنچنا مشکل تھا۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ منشی محمد حسن خاں کے نام کے زیر بحث خط اور اس میں متذکرہ قصیدے اور عرضداشت کا غالب کے سفر کلکتہ کے زمانے سے کوئی تعلق نہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ ایک ہی قصیدے کو قدرے ترمیم و تغیر کے ساتھ مختلف ممدوحین
سے منسوب کرنا غالب کے معمولات میں شامل رہا ہے اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ منشی محمد حسن خاں
کی معرفت پیش کی جانے والی یہ عرضداشت بھی عرضداشت موسومہ آغا میر کی ترمیم یافتہ
شکل ہو اور اس کے آخر میں "دوم محرم الحرام" کا اضافہ اسی نظر ثانی کے وقت کیا گیا ہو
اس صورت میں ہمیں اپنے پیش کردہ تمام قرائن اور قیاسات کو نظر انداز کر کے مکتوب موسومہ
منشی محمد حسن خاں کی تاریخ تحریر ۱۸ر جون ۱۸۳۴ء اور راجا صاحب رام کے وکیل کی معرفت
سبحان علی خاں کی خدمت میں قصیدے اور عرضداشت کی روانگی کی تاریخ ۱۰ر مئی ۱۸۳۴ء
قرار دینا ہوگی۔ آخر الذکر تاریخ از روئے تقویم یکم محرم ۱۲۵۰ھ سے مطابقت رکھتی ہے
رویت میں ایک دن کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے "دوم محرم الحرام" کے مطابق تسلیم
کیا جاسکتا ہے۔ "پنج آہنگ" کے ایک قلمی نسخے (مخزونہ بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری)
کے مطابق تاریخ کا یہ اضافہ بہر حال ۱۳ر رجب المرجب ۱۲۵۷ھ (۲۲ اگست ۱۸۴۱ء)
سے قبل عمل میں آچکا تھا۔[۱۵]

منشی محمد حسن خاں کے نام کے محولۂ بالا خط کے سلسلے میں ایک اور غلطی کی نشاندہی
بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ "کلیاتِ نثرِ غالب" کے پانچویں ایڈیشن (مطبوعہ اپریل
۱۸۸۶ء) میں اسی خط میں سہو کاتب کی بنا پر "ہیزدہم ماہِ ترسایاں" کی بجائے "سیزدہم ماہِ
ترسایاں" شایع ہوا ہے۔ اس اختلافِ متن کے باعث جناب نذیر الحسن عابدی نے اس کی
تاریخ تحریر ۱۳ر ستمبر ۱۸۲۶ء متعین کی ہے اور اس سے چالیس روز قبل راجا صاحب
رام کے توسط سے بھیجی ہوئی عرضداشت کو عرضداشت موسومہ آغا میر مورخہ دوم
محرم الحرام تصور کر کے اسے جمعہ ۴ر اگست ۱۸۲۶ء کی تحریر قرار دیا ہے[۱۶] حالانکہ تقویم کی
رو سے ۲ر محرم ۱۲۴۲ھ ۶ر اگست ۱۸۲۶ء کے مطابق ہے ہجری اور عیسوی تاریخوں کی یہ
مطابقت اس اعتبار سے بھی ناقص ہے کہ ۴ر اگست سے ۱۳ر ستمبر تک دنوں کی تعداد چالیس
کی بجائے اکتالیس ہوجاتی ہے۔

تاریخوں اور دنوں کے اس فرق نے جناب کاظم علی خاں کے لیے ایک نئی مشکل

پیدا کردی۔ موصوف کا ارشاد ہے کہ:۔

"سبحان علی کے نام..... جمعہ ۴ر اگست ۱۸۲۶ء کے مکتوب کے آس پاس ہی غالب نے ۱۶ر اگست ۱۸۲۶ء مطابق ۲ر محرم ۱۲۴۲ھ کو لکھنؤ میں وزیر اودھ آغا میر کے لیے غیر منقوط فارسی نثر بھی تیار کی تھی۔ یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ یہ غیر منقوط نثر اور آغا میر کے لیے عرضی ایک ہی شے ہے یا یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔"[۱۲]

اگر عابدی صاحب نے یہ وضاحت فرمادی ہوتی کہ انھوں نے تقویم ہجری و عیسوی سے اتفاق نہ کرتے ہوئے ۲ر محرم ۱۲۴۲ھ کو ۱۶ اگست کی بجائے ۴ر اگست ۱۸۲۶ء کے مطابق قرار دیا ہے یا جناب کاظم علی خاں کا ذہن اتفاقاً اس طرف منتقل ہو جاتا تو نہ وہ اس مسئلے سے دوچار ہوتے اور نہ انھیں اس کی تحقیق طلبی کی ضرورت محسوس ہوتی۔

غالب کا سفر کلکتہ اور اس کے متعلقات پر تحقیقی یا نیم تحقیقی انداز سے کام کرنے والوں کی مشکلات میں جن تحریروں نے اضافہ کیا ہے ان میں محمد حسن خاں کے نام کا ایک اور خط بھی شامل ہے جو محولہ بالا خط کے معاً بعد لکھا گیا تھا۔ اس خط میں غالب نے اپنے اس مدعا کا اظہار کیا ہے کہ وہ شاہ و وزیر کی اس مدح سرائی کے صلے سے سفر کلکتہ کے لیے زادِ راہ فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

"فرستادن قصیدۂ مدحیہ جامع مدح شاہ و وزیر بیارگراں کایہ عزیمت ارا شائل است، چہ بے سروسامانی مانع کام جوئی و مدعا طلبی افتادہ۔ دلاسے کہ در نارحمت بے زاد نتواں برید و تا جادہ نتواں پیمود، بہ منزل نتواں رسید دست ابیس بر کس بہ گدیہ دراز و کارِ خود از خزینۂ جود چوں خودے بساز نتواں کرد۔ لاجرم خواستہ ام کہ حلقہ در ایں دستور و خسرو بجنبانم۔ بو کہ مرا بجائزہ باد خوانی و صلۂ مدح گستری ایں مایہ سامان فراز آید کہ خود را گرد آوردہ بکلکتہ توانم بردو کارے توانم کرد۔ وقت از دست می رود و ہنگام کار می گذرد۔ اگر دریں نزدیکی تقریبے اندیشیدہ قصیدہ گزاردہ شود موہبتے است سترگ

و بخیالشے است عظیم .....“

(کلیات نثر غالب ص ۱۷۶)

دوسرے تمام شواہد اور امکانات کو نظر انداز کر کے ایک تحریر کے کسی خاص حصے کی بنیاد پر فیصلہ کن نتائج اخذ کرنے والوں کے لیے یہ خط غلط فہمی اور گمراہی کا اچھا خاصا سامان رکھتا ہے۔ چنانچہ بعض حضرات یہ سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ جس قصیدے کا مقصد کلکتہ کے سفر کے لیے زادِ راہ کی فراہمی ہو، اسے غالب کے معلوم سفر کلکتہ سے کس طرح غیر متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب صرف ایک بار کلکتہ گئے تھے لیکن یہ یقین کرنے کے لیے کافی شواہد موجود ہیں کہ پنشن کے مقدمے میں ابتدائی طور پر ناکام رہنے کے باوجود وہ اس کی پیروی کی غرض سے ایک بار پھر کلکتہ جانا چاہتے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ غالب کو اصل شکایت نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جھرکہ سے تھی جنھوں نے ان کے خیال میں پنشن کی مجموعی رقم کو بطورِ خود گھٹا کر اور بعض لوگوں کو غلط طور پر مرزا نصر اللہ بیگ کے وارثوں میں شامل کر کے انھیں ان کے حصے کی ایک بڑی رقم سے محروم کر رکھا تھا۔ لیکن چونکہ یہ تمام فیصلے لارڈ لیک کی منظوری سے ہوئے تھے، اس لیے ریزیڈنٹ سے گورنر جنرل تک کوئی بھی انگریز حاکم اس معاملے میں ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ ۱۸۲۲ء میں جب ولیم فریزر دلی کے ریزیڈنٹ مقرر ہوئے تو انھیں مایوسی کے اندھیروں سے امید کی ایک کرن ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ فریزر نواب احمد بخش جان کے جانشین نواب شمس الدین احمد خاں کی بعض وعدہ خلافیوں کی بنا پر ان کے مقابلے میں ان کے چھوٹے بھائیوں اور احمد بخش کی جائز اولاد نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ وراثت اور ترکے سے متعلق مابہ النزاع امور میں غالب بھی ان دونوں بھائیوں کے طرفدار تھے۔ عین ممکن ہے کہ وہ ان کی کامیابی کو اپنی کامیابی کی ضمانت یا پیش خیمہ سمجھتے ہوں۔ بہرحال جب فریزر کے حسب ایما ۱۸۲۳ء میں نواب امین الدین احمد خاں اپنا مقدمہ عدالت عالیہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے کلکتہ روانہ ہوئے تو غالب خواہش کے باوجود محض اپنی تنگ دستی اور بے بضاعتی کے باعث اس سفر میں ان

کا ساتھ دینے سے معذور رہے اپنی اس "واماندگی و بیچارگی" کا انھیں جتنا شدید احساس تھا، اس کا اندازہ مولوی سراج الدین احمد کے نام کے اس خط کے بعض حصوں سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے نواب امین الدین احمد کو بغرض تعارف لکھ کر دیا تھا۔ اس خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ:-

"برادر صاحب مشفق نواب امین الدین احمد خاں بہادر......
راہماں موجِ تزور قم شکستہ بود، خانہ بسیلابِ فنا داد، خونِ وفایم بگردن که دریں سفر از ہمپائیش بازماندم ..... واماندگی و بے چارگیِ من ازیں جا تواں سنجید که دنداں برجگر نہم و امین الدین احمد خاں بہادر برادر سفر تنہا گذارم ..... ولطف اینست که ہر چند دریں باب به گفتار گرایم و ہنگامہ پوزش آرایم، شرمساری بیشتر گردد و خجلت افزاید۔"

(کلیات نثر غالب ص ۱۳۵)

اس سے تقریباً تین سال پہلے وہ ۵ جمادی الاولی ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۸۳۱ء کو مقدمے میں ناکامی اور دادرسی کی غرض سے دوبارہ حکام صدر کی طرف رجوع کے ارادے کا ذکر کرتے ہوئے مولوی صاحب موصوف کو یہ لکھ چکے تھے:

"کارِ من بدادگاہِ دہلی ..... تباہی گزید۔ حالیا براں سرم که اگر مرگ اماں دہد، بازبداں در رسم و دردِ دل بداں زمزمہ فرو ریزم که مرغانِ ہوا و ماہیانِ دریا را بر خود بگریانم۔"

(کلیات نثر غالب ص ۱۴۴)

مولوی سراج الدین احمد کے موسومہ مکتوبات میں سے ایک اور خط سے بھی جو ایک مشترک دوست مرزا احمد بیگ طپاں کی تعزیت کے سلسلے میں لکھا گیا تھا دوسری بار کلکتے کے سفر کے لیے ان کی اس آمادگی اور اشتیاق کا اظہار ہوتا ہے، لکھتے ہیں که
"ہنوز ہنگامِ مُردنِ مرزا احمد نبود چراں آں قدر صبر نه کرد که به کلکته رسیدمے و در روے نظارہ فروزش دیگر بارہ دیدمے۔" (کلیات نثر غالب ص ۱۴۰)

نواب امین الدین احمد خاں جس خاندانی نزاع کے تصفیے کے لیے کلکتہ گئے تھے، اس کا فیصلہ ان کے حق میں ہوا۔ چونکہ ان کی اس کامیابی میں ولیم فریزر کی حمایت کو بڑا دخل تھا اس لیے نواب شمس الدین احمد خاں نے ان سے انتقام لینے کی ٹھان لی اور ایک سازش کے تحت ان کے مصاحبِ خاص اور داروغہ شکار کریم خاں نے ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔[۵۸] غالب کے لیے جو اس عالمِ مغلوبیت میں فریزر کو اپنا "مربّی" سمجھتے تھے، یہ حادثہ انتہائی پریشان کن ثابت ہوا۔ چنانچہ ناسخ کو ۱۶ جون ۱۸۳۵ء کے خط میں اس واقعے کے اثرات سے مطلع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یکے از ستم گرانِ خدا ناترس ...... فریزر صاحب بہادر را ......
در شبِ تاریک بضربِ تفنگ کشت و ماتمِ مرگِ پدر تازہ کرد۔ دل از جائے رفت و سترگ اندوہے سراپائے اندیشہ را فرو گرفت۔ خرمنِ آرمیدگی پاک بسوخت و نقشِ امید از صفحۂ ضمیر سراسر سترده شد۔"

(کلیاتِ نثرِ غالب، ص ۱۶۱، ۱۶۲)

فریزر کے قتل کے بعد اس واقعے کی تفتیش شروع ہوئی اور قتل اور ترغیبِ قتل کے جرائم کی پاداش میں ۲۶ اگست ۱۸۳۵ء کو کریم خاں کو اور ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو نواب شمس الدین احمد خاں کو پھانسی دے دی گئی اور ان کی جاگیر بحقِ سرکار ضبط کر لی گئی۔ اس صورتِ حال نے غالب کو ایک بار پھر امید افزا خواب دیکھنے کا موقع فراہم کر دیا۔ چنانچہ ناسخ ہی کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ:

"جاگیر دار فیروز پور بہ چالو کشتہ شد و جاگیرِ وے و ہر چہ بجاگیر پیوند داشت بسرکار ضبط گردید، امّا ہنوز حکمے کہ حاویِ جمیع مراتب و جامعِ ہمگی قواعد تواند بود، صدور نیافتہ ...... من کہ از میانۂ آں جاگیر بحکمِ سرکارِ انگریزی زرے می یافتم، بنگرم این فرمان دہاں با من چہ می کنند ہنوز از منتظرانِ آثارِ یاوریِ بختم، صاف ترک اینکہ آنچہ جاگیر دار

قیر در پور ہیں می داد از مقدار بایست کمتر بودہ و بداں قدر از سرکار قانع نیستم۔"

(کلیات نثر غالب ص ۱۶۴)

نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے محافظ خانے میں غالب کے مقدمۂ پنشن کے جو کاغذات محفوظ ہیں، ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کی اس تبدیلی کے بعد انھوں نے پنشن کی رقم میں اضافے اور کئی برسوں کے زرِ بقایا کی وصولی کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دی تھیں۔ ۵ر دسمبر ۱۸۳۶ء کو انھوں نے اپنی ایک درخواست میں گورنر جنرل کو لکھا تھا کہ ان کا مقدمہ یا تو باقاعدہ سماعت کی غرض سے صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے سپرد کر دیا جائے یا اس کے تمام کاغذات آخری فیصلے کے لیے بادشاہ سلامت بہ اجلاس کونسل کے حضور میں ارسال کر دیے جائیں۔[19] اس پس منظر میں دوبارہ کلکتے کے سفر کے لیے غالب کی آمادگی میں کسی شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ منشی محمد حسن خاں کے نام کے دوسرے خط میں انھوں نے اسی متوقع سفر کلکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لکھنؤ کے زمانۂ قیام کے واقعات و معاملات سے متعلق غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کی اس تصحیح و تردید کے بعد ہمیں غالب کے ساتھ کلکتے تک اپنا سفر جاری رکھنے کے لیے ایک بار پھر کانپور کی طرف لوٹنا ہوگا۔ رائے چھج مل کے نام کے خط کے حوالے سے یہ بات ہمارے علم میں آ چکی ہے کہ غالب ۲۶ر ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۲۲ر جون ۱۸۲۷ء کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۲۹ر ذی قعدہ مطابق ۲۵ر جون کو کانپور پہنچے تھے۔ اسی خط میں انھوں نے رائے صاحب کو یہ اطلاع بھی دی تھی کہ:

"این جا (کانپور) دو سہ مقام گزیدہ رہگرا سے باندہ می شوم دراں جا چند روز آرمیدہ اگر خدا می خواہد و مرگ اماں می دہد، بہ کلکتہ می رسم۔"

(کلیات نثر غالب ص ۱۵۹)

کانپور میں دو تین روز قیام کے بعد باندہ کے لیے ارادۂ سفر سے متعلق اس بیان سے

یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب جولائی ۱۸۲۷ء کے پہلے ہفتے میں وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ کان پور اور باندہ کا درمیانی فاصلہ نوّے میل یا ایک سو چوالیس کلو میٹر یعنی لکھنؤ اور کان پور کی درمیانی مسافت (۴۵ میل یا ۷۲ کلو میٹر) سے دوگنا ہے۔ ان کی معلوم رفتارِ سفر کے پیشِ نظر اس فاصلے کے طے کرنے میں زیادہ سے زیادہ آٹھ روز صرف ہوئے ہوں گے۔ باندہ کی طرف سفر کے محرکات، وہاں قیام کی مدت اور آئندہ سفر پر روانگی کے متعلق محولۂ سالا عرضی دعویٰ میں انھوں نے لکھا ہے کہ:-

"میرے بزرگوں اور نواب ذوالفقار علی خان بہادر کے باہمی پرانے تعلقات تھے ..... یہاں میں تقریباً چھ مہینے تک نواب صاحب کے مکان پر رہا۔ خدا کے کرم اور نواب صاحب کی ہمدردی، تیمارداری اور توجہ سے مجھے اس خطرناک بیماری سے نجات ملی۔

اب بارشیں ختم ہو چکی تھیں اور نواب گورنر جنرل بہادر بھی کلکتے مراجعت فرما چکے تھے۔ میں فیروز پور سے تو دلی نہیں جا سکا تھا، اب باندے سے کیسے اور کیوں کر اس کی جرأت کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے خیال کیا کہ آخر دلی اور کلکتہ دونوں جگہ قانون تو وہی ایک سا ہے۔ مجھے سارا معاملہ حکومت کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے چونکہ کشتی سے سفر کرنے کی میری مقدرت نہیں تھی، مجبوراً مجھے خشکی کے راستے گھوڑے کی سواری سے کلکتے جانا پڑا۔"

غالب کے اس بیان کو اگر ان کے اس پچھلے بیان سے کہ "لکھنؤ کی آب و ہوا مجھے بالکل راس نہیں آئی" ملا کر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باندے کے سفر کی اصل غرض و غایت آب و ہوا کی تبدیلی تھی اور کلکتے جانے کا خیال باندہ پہنچنے کے بعد ہوا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ کلکتے کے سفر کا منصوبہ پہلے ہی بنایا جا چکا تھا اور باندے کے اس سفر کی زحمت محض زادِ راہ کی فراہمی کی غرض سے اٹھائی گئی تھی۔ چنانچہ محمد علی خاں (صدر امین باندہ) کے نام کلکتہ سے لکھے ہوئے ایک خط میں جو بروز جمعہ ۷ ذی الحجہ ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۰ جون ۱۸۲۸ء کو تحریر کیا گیا تھا، انھوں نے واضح طور پر اس بات کا اقرار کیا ہے کہ:

"چوں در باندہ رسیدم، دو ہزار روپیہ از نواب وام خواستم......

و پارۂ از بایستنی ہائے زمستان گرد آوردم و بادیہ فرسایاں بہ کلکتہ رسیدم"۔

(نامہ ہائے فارسی غالب ص ۴۱)

غالب باندہ سے کلکتہ کے لیے بقول خود "بارشیں ختم ہونے کے بعد" روانہ ہوئے تھے۔ برسات کا موسم بالعموم ستمبر کے مہینے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے گورنر جنرل یقیناً اس سے بھی پہلے کلکتہ واپس پہنچ چکے ہوں گے کیوں کہ ۳ جولائی ۱۸۲۷ء کو میرٹھ پہنچنے اور وہاں چند روز قیام کرنے کے بعد ہی ان کا سفر مراجعت شروع ہو گیا تھا۔ بہر صورت جولائی ۱۸۲۷ء کے پہلے ہفتے سے ستمبر کے اواخر یا اکتوبر کے اوائل تک شمار کرنے کی صورت میں قیام باندہ کی مدت کسی طرح تین ماہ سے متجاوز نہیں ہو سکتی، اس لیے ان کا یہ بیان کہ وہ چھ مہینے تک باندہ میں مقیم رہے یکسر خلاف واقعہ ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق غالب نے کلکتے کا یہ سفر برسات کے موسم کے اختتام کی بجائے آغاز زمستاں یعنی نومبر کے مہینے میں شروع کیا تھا۔ بنارس سے روانگی کی تاریخ وہاں قیام کی مدت اور باندہ سے بنارس تک مرحلہ وار قطعِ منازل سے متعلق خود ان کے بیانات کی روشنی میں ہمارا اندازہ یہ ہے کہ وہ نومبر ۱۸۲۷ء کے دوسرے ہفتے میں اس سفر پر روانہ ہوئے تھے اور تقریباً پچیس میل (چالیس کلومیٹر) کی مسافت طے کر کے پنجشنبہ ۱۵ نومبر کو مودہا پہنچے تھے۔ مودہا میں انھوں نے یکشنبہ ۱۸ نومبر تک آرام کیا۔ دوشنبہ ۱۹ نومبر کو وہاں سے روانہ ہو کر آئندہ شب ایک گاؤں میں بسر کی اور سہ شنبہ ۲۰ نومبر کو چلہ تارا پہنچے۔ ارادہ یہ تھا کہ چلہ تارا کی کارواں سرائے میں ایک رات گذار کر دوسرے دن فتح پور کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن جس "لڑھیا" (بیل گاڑی) میں مودہا سے چلہ تارا تک کا فاصلہ طے کیا وہ انتہائی سست رفتار تھی، اس لیے اسے چھوڑ کر ایک کشتی کرایے کی اور دریا کے راستے الہ آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ ملاحوں کو یقین دہانی کے مطابق یہ سفر تین دن میں طے ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس میں چھ دن سے زیادہ صرف ہوئے اور یہ کشتی ساتویں روز یعنی سہ شنبہ ۲۷ نومبر کو الہ آباد پہنچی۔ یہ شہر غالب کے لیے خلافِ توقع انتہائی وحشت خیز اور تکلیف دہ ثابت ہوا۔ یہاں نہ انھیں حسب ضرورت کوئی دوا دستیاب ہوئی، نہ کوئی "متاع

شائستہ" میسر آسکی۔ زن و مرد عموماً شرم و حیا سے بے گانہ اور پیر و جواں محبت و مروت سے
بے بہرہ نظر آئے۔ حتّٰی کہ ان کے نزدیک اس "وادیِ ہولناک" کو شہر کہنا "ناانصافی" اور
اس "دام گاہِ غول" میں آدم زاد کا قیام کرنا "بے حیائی" قرار پایا۔ چنانچہ انھوں نے اس "خرابہ"
میں ایک شب بدرجۂ مجبوری اس طرح بسر کی جیسے کوئی قیدی قید خانے میں رات بسر کرتا ہے اور
دوسرے روز یعنی ۲۸ نومبر کو علی الصباح کشتی کے ذریعے بنارس کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ سفر انھوں
نے بقول خود اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ طے کیا تھا جس رفتار سے ہوا سطحِ
آب سے گذرتی ہے اس لیے ہمارا اندازہ یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دسمبر ۱۸۲۷ء کی
پہلی تاریخ تک بہرحال بنارس پہنچ گئے ہوں گے۔ بنارس کی فضا اور یہاں کی آب و ہوا ان
کے لیے جنتِ نگاہ اور سرمایۂ نشاط ثابت ہوئی، حتّٰی کہ بیماری کے اثرات یکسر زائل ہو گئے اور
جسم و جان میں توانائی اور فرحت کی ایک نئی رَو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ یہاں کے مناظر
میں دل فریبی کی وہ شان نظر آئی کہ رنجِ مسافرت اور غمِ غربت کی کاوشیں فراموش ہو گئیں
اور انبساط و سرخوشی کے وفور نے وہ رنگ جمایا کہ وطن کی یاد اور دہلی کا تصور طاقِ نسیاں
کی زینت بن گیا۔ یہاں تک کہ اگر ایک اہم مقدمہ درپیش اور شماتتِ اعدا سے دل ریش
نہ ہوتا تو وہ بقولِ خود گنگا کے کنارے فقیروں کی طرح دھونی رما کر بیٹھ جاتے اور خود کو
"گردِ آلائشِ ہستی" سے پاک کر لیتے۔ مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کے نام جس خط میں
غالب نے بنارس کے متعلق اپنے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے، وہ وہاں پہنچنے کے ایک ہفتے
بعد لکھا گیا تھا۔ اس درمیان میں وہ پانچ روز سرائے نیرنگ آباد معروف بہ نورنگ آباد
(کذا۔ اونگ آباد) میں قیام کے بعد اسی محلے میں ایک کرایہ کے مکان میں منتقل ہو چکے تھے
اور اس "ہفتہ بہ غفلت بسر رفتہ" کو شامل کر کے یہاں مجموعی طور پر چار ہفتے قیام کا ارادہ
رکھتے تھے تاکہ آگے سفر شروع کرنے سے پہلے ضروری دواؤں اور موسم سرما کی مناسبت
سے مزید سامانِ آسائش کا بندوبست کر لیا جائے۔ مکتوب الیہ موصوف کے نام اگلے خط
میں جو اس خط کا جواب الجواب ہے، اس میقاتِ قیام و سفر میں کسی تبدیلی کی طرف اشارہ
کیے بغیر لکھتے ہیں کہ:

"امروز کہ آدینہ و بقول جمعے نہم ماہ و بہ اظہار گروہے دہم ست، دل بر بستن رخت سفرم، اگر شب بخیر گذشت و وجود معدوم را جمع بہ عدمیت اصلی خود نگشت، فردا بروز شنبہ از بنارس می پویم"

(کلیات نثر غالب ص ۱۶۵)

بعد کی معلوم تاریخوں کو نظر میں رکھ کر تقویم کی جانب رجوع کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس خط میں مذکورہ نویں یا دسویں تاریخ ماہ جمادی الاخری ۱۲۴۳ھ کے علاوہ کسی اور مہینے کی نہیں ہو سکتی۔ تقویم ہجری و عیسوی کے مطابق اس روز دسمبر ۱۸۲۷ء کی اٹھائیسویں تاریخ تھی۔ گویا غالب ۱۰ یا ۱۱ جمادی الاخری ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۹/۳۰ دسمبر ۱۸۲۷ء کو بنارس سے کلکتے کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ عرضی دعویٰ پنشن کے مطابق چونکہ کشتی سے سفر کرنے کی مقدرت نہیں تھی، اس لیے بدرجۂ مجبوری کا یہ طویل مسافت خشکی کے راستے گھوڑے کی سواری سے طے کرنا پڑی۔ مولوی محمد علی خاں کے نام محولہ بالا خط میں اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ:-

"نہفتہ نماند کہ ناخدایان خدا ناشناس بنارس در باب کشتی مضایقہ کردند، چہ بہر کہ برخوردم، تا کلکتہ کم از صد روپیہ نطلبید و تا پٹنہ افزون از بست روپیہ خواست، ناچار میان اسپ سوارہ تا بدان بقعہ صحرا خرامم پیمودہ و ہنوز ہواے کشتی از سر بدر نرفتہ – در پٹنہ نیز جستجو خواہم نمود"

(کلیات نثر غالب ص ۱۶۵، ۱۶۶)

چار سوا چار سو میل کا یہ طویل سفر پورے تریپن دن میں طے کر کے مرزا صاحب شنبہ ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو "شدت برد لیالی" سے "افسردہ و رنجور" اور "تاثیر گردش ایام" سے "ستم رسیدہ و نالاں" کلکتے پہنچے۔ اگرچہ ان کی کسی تحریر سے اس کا سراغ نہیں ملتا تاہم خیال یہ ہے کہ اس درمیان میں انھوں نے دم لے کر آگے بڑھنے کے لیے وقفۂ ماندگی کے طور پر کم از کم پٹنہ اور مرشدآباد میں ضرور قیام کیا ہوگا۔

کلکتے میں وہ جمعہ ۳ صفر ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۲۹ء تک قیام پذیر رہے۔ کامل

ڈیڑھ برس کی اس مدت میں انھوں نے اپنے مقدمے کی پیروی کے پہلو بہ پہلو ادبی محاذ پر اپنی انفرادیت اور امتیاز کا لوہا منوانے میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی اس سلسلے کے بیشتر واقعات اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ ہماری ادبی تاریخ میں محفوظ ہیں "نامہ ہائے فارسی غالب" کی اشاعت کے ساتھ مقدمے کے سلسلے کی بعض گمشدہ کڑیاں بھی دریافت ہو چکی ہیں۔ کلکتے سے روانگی سے متعلق غالب نے ۱۴ اگست ۱۸۲۹ء کے ایک خط میں لکھا ہے کہ میں کل بروز شنبہ ۱۵ اگست کو ورنہ یکشنبہ یا دوشنبہ کو بہر حال یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا[22] دہلی سے کلکتے تک کے سفر میں ایک گھوڑا، ایک سائیس، ایک چرکٹا، تین ذاتی خدمت گار اور ایک کہار مرزا صاحب کے ساتھ تھے۔ کلکتے پہنچنے کے بعد جب معاملات طول کھینچتے ہوئے نظر آئے تو انھوں نے (۱۹ ربیع الثانی ۱۲۴۴ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۸۲۸ء سے قبل) گھوڑا ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کر دیا اور سائیس اور چرکٹے کو چھٹی دے دی[23] اس لیے واپسی کے سفر کا بڑا حصہ کشتی کے ذریعے طے ہوا۔ اگست کے وسط میں کلکتے سے روانہ ہو کر وہ یکم جمادی الاول ۱۲۴۵ھ مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۸۲۹ء کو باندہ پہنچے[24] اور چند روز وہاں قیام کرنے کے بعد یکم جمادی الثانی مطابق ۲۹ نومبر کو یکشنبہ کے دن اس طرح دہلی میں وارد ہوئے جیسے کوئی بچہ "دبستاں" میں اور قیدی "زنداں" میں پہنچتا ہے[25] اس کے بعد غالب کو شدید خواہش اور اشتیاق کے باوجود پھر کبھی کلکتے جانے کا موقع نہیں ملا لیکن اس شہر کے "سبزہ زار ہائے مطرا" اور "بتانِ نازنینِ خود آرا" کی یاد جس طرح انھیں تا عمر تڑپاتی رہی، اس کا اندازہ اس قطعے سے کیا جا سکتا ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

حواشی

۱ـ بحوالہ "مقدمۂ پنشن کا عرضی دعویٰ" از مالک رام مشمولہ "فسانۂ غالب" ص ۱۱۰ تا ۱۱۳

۲ـ غالب مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خبراست کہ نواب عالی جناب بتاریخ چہاردہم مارچ در متھرا رسیدہ..... اند و فردا کہ شانزدہم مارچ است کوچ می کنند و منزل بہ منزل می خرامند و بتاریخ بست وچہارم مارچ بہ دہلی می رسند۔"

(متفرقات غالب ص ۸۱، ۸۲)

اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دہلی اور متھرا کے درمیان کی مسافت نو دن میں طے ہوتی تھی۔ اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ غالب ۲۸ نومبر ۱۸۲۵ء کو دہلی سے روانہ ہوکر ۶ دسمبر کو متھرا پہنچے ہوں گے۔

۳ـ "نامہ ہائے فارسی غالب" میں شامل مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کے نام کے پہلے خط سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق کے نام یہ خط سفرِ مشرق کے آغاز سے قبل (در مبادیِ بسیجِ سفرِ مشرق) قیام فیروز پور کے زمانے میں لکھا گیا تھا (ص ۱) لیکن "کلیات نثرِ غالب" میں اس خط کی یہ بس نوشت کہ "چوں سر رشتۂ ہر کار بہ رانے بازبستہ است، ودراں کشاکش از بند نتوانم بدر جست، بیخودی گریبانم گرفت و بازم بہ دہلی آورد" (ص ۶۴) اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ اس سے پہلے کے سفر کے زمانے سے متعلق ہے خط کے مشمولات اور "نامہ ہائے فارسی غالب" میں شامل مکتوب موسومہ محمد علی خاں کی قدامت کے پیشِ نظر ہمیں ان مختلف فیہ بیانات میں سے پہلا بیان زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے۔

۴ـ ابن حسن خاں کے نام کے اس خط کی متعلقہ عبارت درج ذیل ہے۔

"نامہ نگار پایانِ ہجراں روائی شاہِ زمن وانجامِ کار کیانی معین الدولہ

در لکھنؤ روے آوردہ و کما بیش پنج ماہ دراں شہر آب خورد کردہ" (سہ ماہی "اردو ادب" علی گڑھ شمارہ ۳، ۴ ۱۹۵۲ء ص ۹۹)

ﮧ "تحقیقی نوادر" ص ۴۰۹

ﮧ غالب کا قیام لکھنؤ۔ تحقیق کی روشنی میں مشمولہ ہفتہ وار "ہماری زبان" مورخہ یکم مارچ ۱۹۸۰ء۔

ﮧ "نامہ ہائے فارسی غالب" ص ۱۳۔

ﮧ بحوالہ "غالبیات کے چند مباحث" از ڈاکٹر ابو محمد سحر ص ۲۰۵۔

ﮧ "غالب" ص ۱۱۰ بحوالہ ہفتہ وار "ہماری زبان" شمارہ محولۂ بالا ص ۲۔

ﮧ "ذکر غالب" ص ۶۰ و ۶۱ بحوالہ ہفتہ وار "ہماری زبان" شمارہ محولۂ بالا ص ۲۔

ﮧ غالب کا قیام لکھنؤ۔ "ہماری زبان" شمارہ محولہ بالا ص ۲۔

ﮧ ایضاً مضمون محولۂ صدر ص ۱

ﮧ اس قطعۂ تاریخ کے چند اشعار یہ ہیں:

اسد اللہ خاں کہ خوانندش ۔۔۔ در سخن غالبِ لطیفہ سگال

بر ادائے گزارشِ تاریخ ۔۔۔ ریخت بر گوشۂ بساط لآل

بہر ترتیب ایں ہمایوں جشن ۔۔۔ کہ بہ خسرو خجستہ باد بہ فال

زد رقم "بزمِ عشرتِ پرویز" ۔۔۔ دیں کہ گفتم بود زروے وصال

در تو خواہی کہ آشکار شود ۔۔۔ نقشِ اندازۂ مسیحی سال

"شاہدِ بختِ پادشاہ" نویس

واں ہشش بر فزاے "حسنِ کمال"

ڈاکٹر اکبر حیدری لکھتے ہیں کہ غالب نے یہ قطعہ تاریخ ۱۲۴۴ھ میں لکھا تھا۔ یہ سنہ انھوں نے "بزم عشرت پرویز" سے حاصل کیا ہے جو ان کے نزدیک اس جشن کا مادۂ تاریخ ہے (تحقیقی نوادر ص ۴۰۵) لیکن یہ خیال درست نہیں۔ نصیر الدین حیدر کی دوسری

شادی ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں ہوئی تھی اور اس قطعے کے دونوں مادہ ہائے تاریخ سے بھی یہی دونوں سنہ برآمد ہوتے ہیں۔ سنہ ہجری "بزم عشرت پدوینہ" میں "روے وصال" یعنی واو کے چھ عدد شامل کرنے کے بعد اور سال مسیحی "شاہ بخت پادشاہ" کے اعداد (۱۶۲۵) میں "حسن کمال" کے دو سو نو اعداد کے اضافے کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۱۴؎ تواریخ اودھ از سید کمال الدین حیدر جلد اول ص ۳۳۰

۱۵؎ "پنج آہنگ" کا یہ نسخہ گنگا پرشاد نامی کاتب نے "بموجب فرمائش نواب صاحب والا مناقب انور الدولہ محمد شمس الدین حسن خاں بہادر" بمقام شاہجہاں آباد چہارم ماہ رجب المرجب ۱۲۵۷ھ (۲۲ اگست ۱۸۴۱ء) کو لکھ کر مکمل کیا تھا۔

۱۶؎ "پنج آہنگ" طبع لاہور ۱۹۶۹ء بحوالہ "ہماری زبان" شمارہ محولہ صدر ص ۷

۱۷؎ ہفتہ وار "ہماری زبان" شمارہ محولہ صدر ص ۷

۱۸؎ اس سلسلہ کی تفصیلات کے لیے مالک رام صاحب کا مضمون "نواب شمس الدین احمد خاں" مشمولہ "فسانۂ غالب" (ص ۹۲ تا ۱۰۵) دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۹؎ بحوالہ "غالب کا مقدمہ پنشن" از خواجہ احمد فاروقی مشمولہ "چراغ رہگذر" ص ۴۶

۲۰؎ یہاں اور اس سے آگے مختلف مقامات پر غالب کے ورود اور وہاں سے روانگی کی تاریخیں "نامہ ہاے فارسی غالب" میں شامل خطوط نمبر ۲ (ص ۱۶) نمبر ۳ (ص ۱۷، ۱۸) اور نمبر ۴ (ص ۲۰، ۲۱) کی مدد سے متعین کی گئی ہیں۔ ان خطوں میں غالب نے صرف آمد، قیام اور روانگی کے دنوں کا ذکر کیا ہے۔ تاریخوں اور مہینوں کا تعین بنارس میں قیام کی مدت اور وہاں سے روانگی کے متعلق ان کے بیانات پر مبنی ہے۔

۲۱؎ "نامہ ہاے فارسی غالب" ص ۳۶۔ یہ مجموعہ جس مخطوطے پر مبنی ہے، اس کے مطابق غالب نے اس خط میں ورود کلکتہ کی تاریخ "سہ شنبہ چہارم شعبان" تحریر کی تھی۔ مرتب مجموعہ جناب اکبر علی ترمذی نے تقویم ہجری و عیسوی سے عدم مطابقت کی بنا پر ان کے اس بیان کو رد کر کے متن کتاب میں "سہ شنبہ" کو "چہار شنبہ" بنا دیا ہے۔ اس

حیرت انگیز ستم ظریفی (اور اس کا اعادہ انھوں نے بار بار کیا ہے) کے نتیجے میں غالب کے کلکتہ پہنچنے کی تاریخ ۱۹ فروری کی بجائے ۲۰ فروری ہو گئی (مقدمہ بزبان انگریزی ص ۲۳ و توقیت سفرِ کلکتہ ص ۲) جو یقیناً غلط ہے۔ مالک رام صاحب نے اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا کر اسے ۴ شعبان مطابق ۲۱ فروری کا واقعہ قرار دیا ہے (توقیت غالب شمولہ "فسانۂ غالب" ص ۱۴)

۲۲۔ نامہ ہائے فارسیِ غالب ص ۸۷

۲۳۔ ایضاً ص ۴۴ و ۴۵

۲۴۔ ایضاً ص ۹۰ و ۹۱ بحوالۂ مکتوب موسومہ علی اکبر خاں طباطبائی مرقومہ از باندہ بتاریخ ۶ جمادی الاول روز چہار شنبہ

۲۵۔ ایضاً ص ۹۳۔ غالب نے علی اکبر خاں طباطبائی کے نام اس خط میں اپنے ورود کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "یکم جمادی الثانی روز یکشنبہ کودک بہ دبستاں و قیدی بہ زنداں و غالبِ مستہام بہ وطن رسید" اس کے برخلاف ایک دوسرے صفحے پر لکھتے ہیں کہ "یکشنبہ دوم جمادی الثانی سعی آوارگی در زاویۂ دہلی پاے بدامن کشید" (کلیات نثر غالب ص ۱۲۵) تاریخ کے اس فرق کو خواہ سہوِ قلم پر مبنی تصور کیا جائے، خواہ اختلاف رویت پر، بہر دو صورت یکشنبہ کی قید برقرار رہنے کی بنیاد پر عیسوی تاریخ (۲۹ نومبر) سے اس کی مطابقت میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔

(مجلہ "غالب نامہ" دہلی، شمارہ جنوری ۱۹۸۱ء)

غالب کی ایک غزل

اور

مرزا یوسف

میرزا یوسف میرزا غالب کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ انھوں نے بقولِ غالب ساٹھ برس کی عمر میں دو شنبہ، ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ (۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء) کو وفات پائی۔[51] "دستنبو" میں غالب نے اس سانحے کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اپنے بھائی سے بے پناہ محبت تھی۔ ایک غزل کے مقطع میں بھی انھوں نے اسی جذبۂ محبت کے تحت ایک خاص موقع پر اس طرح اظہار مسرت کیا تھا :

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی

میرزا یوسف ہے غالب! یوسفِ ثانی مجھے

مالک رام صاحب کا خیال ہے کہ یہ شعر کسی تشویشناک بیماری سے میرزا یوسف کی صحت یابی کے موقع پر کہا گیا تھا۔[52] ضیاء الدین شکیب نے بھی اسے میرزا یوسف کے غسلِ صحت سے متعلق قرار دیا ہے۔[53] بات بظاہر لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن نہ تو غالب کی کوئی تحریر اس تشویشناک علالت اور صحت یابی کے زمانے کی واضح پر نشاندہی کرتی ہے اور نہ ان کے کسی سوانح نگار نے اس کے تعین کی کوشش کی ہے۔ پیشِ نظر سطور کا مقصد اسی زمانے کا تعین ہے۔

غالب کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا یوسف ان سے دو سال چھوٹے

تھے اور ساٹھ سال کی عمر میں سے انھوں نے تیس سال عالمِ ہوش و حواس میں اور باقی تیس
برس دیوانگی اور بے ہوشی کی حالت میں گزارے۔[۲۲] گویا وہ ۱۲۱۴ھ (۱۸۰۰-۱۷۹۹ء) میں پیدا
ہوئے اور ۱۲۴۴ھ (۲۹-۱۸۲۸ء) تک باہوش و حواس رہے لیکن غالب ہی کے ایک
دوسرے بیان سے جو زیادہ واضح اور قابلِ وثوق ہے، یہ پتہ چلتا ہے کہ میرزا یوسف کی طویل
علالت کا سلسلہ دسمبر ۱۸۲۵ء (جمادی الاول ۱۲۴۱ھ) میں غالب کی سفرِ بھرت پور و
کلکتہ پر روانگی سے قبل شروع ہو چکا تھا اور وہ بقولِ خود انھیں "بخار اور ہذیان کی حالت"
میں چھوڑ کر اور "دو چار آدمیوں کو ان کی نگہداشت کے لیے" مقرر کر کے اس سفر پر روانہ ہوگئے
تھے۔[۲۳] میرزا یوسف کی حقیقی بہن کے پوتے اور ان کی نواسی کے شوہر نواب سرور الملک کے
بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا یوسف دیوانگی سے قبل "افواجِ قاہرۂ دولتِ آصفیہ میں نہایت
مقتدر عہدے پر سرفراز تھے (اسی زمانے میں) کسی دشمن نے ایسا جادو کیا یا ایسی دوا کھلا
دی کہ وہ مجنونِ محض ہو گئے اور تا وقتِ انتقال مجنون رہے"۔[۲۴] غالباً اسی حالتِ جنون میں
وہ حیدرآباد سے دلی آئے اور اس کے بعد ان کی بیماری تا عمر میرزا غالب کے لیے سوہانِ روح
رہی۔ جن حضرات نے تفصیل کے ساتھ ان کے حالات لکھے ہیں، وہ بھی بعد کے اس زمانے میں ان
کی صحت یابی کے کسی ایسے موقع کی نشاندہی نہیں کرتے جسے، غالب کے "الفاظ میں ازسرِ نو
زندگی پانے" سے تعبیر کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ ان کے سوانح کے ضمن میں زیرِ بحث شعر جس انداز
سے پیش کیا جاتا رہا ہے اس سے بھی اس طویل سلسلۂ علالت سے اس کا تعلق ظاہر نہیں ہوتا
حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا تعلق دیوانگی و بے ہوشی کے اسی زمانے سے ہے مگر اس کا محرک
فی الواقع میرزا یوسف کی صحت یابی نہیں بلکہ ان کی حالت میں غیر معمولی تبدیلی کی ایک خوش
کن لیکن بے بنیاد اطلاع ہے۔

یہ شعر جس غزل سے تعلق رکھتا ہے ____ وہ متداول دیوانِ غالب میں
شامل ہے اور نو اشعار پر مشتمل ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں بھی اسی زمین میں ایک غزل موجود ہے
لیکن اس کے سات شعروں میں سے کوئی شعر متداول کلام میں شامل نہیں ہے۔ نسخۂ شیرانی
کی کیفیت قدرے مختلف ہے۔[۲۵] اس میں شامل اس زمین کے نو اشعار میں سے سات

نسخۂ حمیدیہ سے ماخوذ ہیں اور بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں یہ دونوں شعر اس نسخے اور متداول
دیوان میں مشترک ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ کی کتابت اس کے ترقیمے کے مطابق ۵ صفر ۱۲۳۷ھ
(یکم نومبر ۱۸۲۱ء) کو مکمل ہوئی تھی اور یہ بگمانِ غالب اس کلام پر مشتمل ہے جو خود میرزا غالب
کے بقول ان کے ورودِ کلکتہ (واقعہ ۱۴ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء) سے سات برس
قبل ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) میں یا اس سے کچھ پہلے ترتیب پا چکا تھا۔ نسخۂ شیرانی ترقیمے سے
محروم ہے اس لیے اس کے زمانۂ کتابت کا تعین قطعی طور پر نہیں کیا جا سکتا تاہم چوں کہ ایک
ایسی غزل جو غالب نے سفرِ کلکتہ کے دوران قیام باندہ کے زمانے میں کہی تھی اس کے حاشیے پر
لکھی ہوئی ہے[۵] اس لیے قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی کتابت غالب کے کلکتہ روانہ ہونے
سے پہلے مکمل ہو چکی تھی۔ بعض دوسرے قرائن بھی اسی طرف رہبری کرتے ہیں کہ یہ تدوین
کلامِ غالب کے سلسلے میں نسخۂ حمیدیہ سے اگلا قدم ہے۔ اس طرح یہ بات تحقیقی طور پر معلوم
ہو جاتی ہے کہ زیرِ بحث شعر جس غزل کے مقطعے کی حیثیت سے دیوانِ غالب کے متداول ایڈیشنوں
میں شامل ہے، اس کے صرف دو شعر نسخۂ شیرانی کی کتابت یا غالب کی سفرِ کلکتہ پر روانگی سے قبل
کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی سات اشعار بعد کے زمانے میں کہے گئے ہیں۔ ان سات
شعروں میں سے چار شعر نسخۂ شیرانی اور نسخۂ متداول کے دو مشترک اشعار کے ساتھ اس
انتخاب میں بھی موجود ہیں[۶] جو غالب نے قیامِ کلکتہ کے دوران مولوی سراج الدین احمد کے
حسبِ فرمائش خود مرتب کیا تھا اور جسے "گلِ رعنا" کے نام سے قبولِ عام حاصل ہو چکا ہے
"گلِ رعنا" کے ایک قلمی نسخے میں جو لاہور میں خواجہ محمد حسن کے پاس محفوظ ہے، اس کے
دیباچے کے آخر میں تاریخِ تحریر غرۂ ربیع الاول ۱۲۴۴ھ درج ہے جس کی بنیاد
پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ انتخاب سرسری اندازے کے مطابق اس تاریخ سے قبل ترتیب
پا چکا تھا۔ یہ قیاس صحیح نہ ہو تب بھی اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ غالب کی کلکتے
سے روانگی یعنی ۱۴ صفر ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۸۲۹ء سے پہلے اس کی ترتیب و تکمیل
کے تمام مراحل طے ہو چکے تھے۔ اس طرح زیرِ بحث غزل کے نو شعروں میں سے چھ اشعار کا زمانۂ
تصنیف قطعی طور پر متعین ہو جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے اور اس خیال میں بظاہر غلطی کی

کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ باقی تین شعر بھی کلکتہ میں قیام کے اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

میرزا یوسف اپنے طویل زمانۂ علالت میں جن حالات سے دوچار رہے ان کی تمام تفصیلات ہمارے علم میں نہیں۔ غالب کی سب سے پہلی تحریر جس میں ہمیں ان کا ذکر ملتا ہے، مقدمہ پنشن کا وہ عرضی دعویٰ ہے جو قیام کلکتہ کے دوران ۱۳ شوال ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء کو گورنر جنرل کے حضور میں پیش کیا گیا تھا اور جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب انھیں دہلی میں دیوانگی و خود فراموشی کے عالم میں چھوڑ گئے تھے۔ لیکن اس کے دوسرے ہی دن مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کے نام لکھا ہوا خط اس سے مختلف اطلاع فراہم کرتا ہے اور ہمارے علم کی حد تک یہ غالب کی واحد تحریر ہے جس میں وہ دہلی سے موصول شدہ ایک خوش کن اطلاع کی بنا پر میرزا یوسف کی طرف سے بے حد مسرور و مطمئن نظر آتے ہیں۔ دہلی سے یہ مسرت بخش اطلاع ۲۷ رمضان ۱۲۴۳ھ (۱۷ اپریل ۱۸۲۸ء) کو موصول ہوئی تھی۔ مکتوب الیہ موصوف کو اس کی تفصیلات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"..... (حاشیہ) ..... کہ ہرگز گمانِ آں نہ داشتم بلکہ وقوعِ آں را از عالم احیائے اموات می دانستم..... اینک روئے تا بہ من رو آوردہ و مغز جانم را بہ بوئے نشاط عنبر آگیں گردانید..... توضیحِ ایں ابہام و تفصیلِ ایں اجمال ایں کہ میرزا یوسف..... سر شوریدہ داشتہ، سراپا برہنہ و عریاں بودن و خشتِ اہلِ قرب بر سر بحیا معمودان، فرماتے را در گفتن و شہر زدہ دختر را زن و دختر را خواہان۔ بہ در بیست و ہفتم رمضان کتابتے از دہلی رسید۔ چوں بہ سرنامہ نگریستم بہ جز خط بیگانہ کاغذے دیگر یافتم) بخط برادر عقیدت چوں بہ نامہ نگریستم دیدم مکتوبے است کہ خودش نوشتہ و القاب و آداب را..... ہوشمندی بجا بود رعایت کردہ۔ از شادی برجستم و برقص افتادم اگرچہ شادی ہم من ہجوم آوردہ از اندازہ گریستم۔ چوں بہ خود آمدم خود را گرد کردم و بہ تعلیق خط خانگی پرداختم، مرقوم بود کہ بعد شمشیر شورش سودائے میرزا یوسف از حد گذشت چنانکہ بہ ہم رسید و در شب ہا از نالہ و فریاد و

زد و کشتِ او ناخوش گشت ۔ فیل بانے از فیل بانانِ سرکارِ شاہی بذریعہ
مالکے از خدمۂ محل بہم رسید و متوجہ چارہ گردید ۔ آں جنوں را ز آثارِ سحر نشاں
داد و سراغ ہا بیاں کرد ۔ چنانچہ بیرونِ چار دیواری شہر بہ کافتنِ پائے درختے و
جستنِ یک جا ہے اشارت کرد ۔ چوں کافتیم، ہر چہ او گفتہ بود، یافتیم ۔ بالجملہ میرزا
یوسف را دو بہرہ افاقت در معالجۂ مدتِ پنج ماہ دست داد چنانکہ جامہ پوشیدن
و ستر عورت کردن و از بول و براز احتراز داشتن و نان بہ مائدہ خوردن خلف
و دختر و مادر را، زن و دختر و مادر دانستن ملکۂ او گشتہ است ۔ ہم ایں معنی از
روے خطِ خانگی معلوم شد و ہم مکتوبِ او دلیل و گواہِ ہوشمندی ہائے
او شد ۔ باللہ صحبتِ او را گرامی تر از زندہ گشتنِ پدرِ مردہ دانستہ ام امید
کہ جناب نیز بہ عرضِ فقیر او را فرزندِ خود شمردہ مسرور شوند و دعا کنند تا بقیہ بے
خودی نیز رفع گردد ......[۴۹]

یہی صورتِ حال جسے غالبؔ "احیاے اموات" کی طرح ناممکن الوقوع سمجھتے تھے اور
جو ان کے لیے اپنے مرحوم والد کے دوبارہ زندہ ہو جانے سے زیادہ حیرتناک اور نشاط انگیز تھی،
زیرِ بحث شعر کی محرک معلوم ہوتی ہے۔ سرمستی و سرخوشی کی جس والہانہ کیفیت نے ان کے نفسِ ناطقہ
کو تواجد پہ اکسایا اور ان سے یہ عبارت لکھوائی ہے، بہ گمانِ غالب اسی نے ایک دوسرا پیرایۂ اظہار
اختیار کر کے اس شعر کی صورت میں جلوہ نمائی کی ہے۔ چنانچہ محبت کا وہی بے پایاں جوش، دوسروں
کو اپنی مسرت میں شریک کرنے کی وہی بے اختیار خواہش اور امتنان و تشکر کا وہی لامحدود جذبہ
جو اس تحریر کی روحِ رواں ہے، زیرِ بحث شعر کے ایک ایک لفظ میں بھی جاری و ساری نظر آتا ہے۔
اس لیے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ وہ غزل جس میں یہ شعر بطورِ مقطع شامل ہے، اپریل ۱۸۲۸ء کے
نصفِ آخر یا بعد کے بالکل متصل زمانے میں کہی گئی ہے۔

اوپر کے سطور میں جس خط کا اقتباس نقل کیا گیا ہے، وہ ۱۴ شوال ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۹ اپریل
۱۸۲۸ء کو لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد غالبؔ ۱۳ صفر ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۲۹ء تک کلکتے
میں موجود رہے۔ ایک سال ساڑھے تین مہینے کی اس مدت میں انھوں نے جو خطوط لکھے ہیں ان میں

ایک بار بھی میرزا یوسف کا ذکر نہیں کیا۔ دلی پہنچنے کے بعد انھوں نے ۵ رجمادی الثانی ۱۲۴۵ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۸۲۹ء کو نواب علی اکبر خاں طباطبائی کے نام جو خط لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا یوسف کو جو افاقہ ہوا تھا وہ عارضی تھا اور وہ دوبارہ اپنی سابقہ حالت کی طرف لوٹ چکے تھے۔ لکھتے ہیں کہ:

"نخستیں بہرسے کہ بہ مجرّد ورود بر نظارہ ریخت، مشاہدۂ روشیِ ماندو بودِ برادر بود، سلمہ اللہ تعالیٰ کہ از شدتِ علالت تازہ یہ کالبدر سیدہ وہر قطرۂ خوں در تنش از جوشِ سودا سویدا گردیدہ۔ حالے کہ بے دانشاں او را صحیح خیال کردہ بودند، حاشا کہ افاقت بودہ باشد، ہمانا کہ رنگے از فنونِ جنوں بود..... اندیشہ می سنجید کہ اگر ایں حال زائل گردد و مرض بہ صحت مبدّل شود، چہ شگفت، ایدوں کہ حالِ ظاہری مریض خبری دہد و فطرت شفاے بیماراں می پذیرد (کذا: فطرتِ بیمار شفاے رانمی پذیرد) بہ علم الیقین) دانستہ ام کہ میرزا یوسف تا خواہد زیست، بیمار خواہد بود و بس۔"

ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ میرزا یوسف کے حالاتِ زندگی اور بیماری کے سلسلے میں مختلف ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کی روشنی میں اس مقطع کی تصنیف کے محرکات کی تلاش میں ہماری نظر صرف اس خط کے مندرجات پر ہی ٹھہرتی ہے جو دلی سے ان کی کیفیت ظاہری میں غیر معمولی مگر عارضی تبدیلی کی خبر لے کر آیا تھا۔ ممکن ہے ہمارا یہ قیاس درست نہ ہو لیکن دوسرے تمام قیاسات کے مقابلے میں اس کی صحت کے امکانات بہرحال زیادہ قوی ہیں۔

یہاں فارسی کی ایک غزل کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو لسانی اختلاف سے قطع نظر کر کے دوسری مماثلتوں کی بنا پر اسی زمین کی غزلوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ دس اشعار پر مشتمل یہ غزل مندرجہ ذیل مطلعے سے شروع ہوتی ہے ؎

بمنی آید ز چشم از جوشِ حیرانی مرا
شد نگہ زنّارِ تسبیحِ سلیمانی مرا

یہ غزل بھی قیام کلکتہ کے زمانے ہی میں لکھی گئی تھی اور اس کے محرک بھی وہی مولوی سراج الدین احمد تھے جن کے حسبِ فرمائش غالب نے اپنے فارسی و اردو اشعار کا انتخاب "گلِ رعنا" مرتب کیا تھا چنانچہ مقطع میں اس امر کی طرف اشارہ موجود ہے ؎

با سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالب نیست آہنگِ غزل خوانی مرا

ہمیں معلوم ہے کہ کلکتہ کے زمانۂ قیام میں غالب کو کئی محاذوں پر مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مخالفین کے ان مختلف گروہوں کی سربراہی و پشت پناہی ان کے مقدمۂ پنشن کے ایک اہم فریق خواجہ حاجی کے سالے مرزا افضل بیگ کر رہے تھے جو اکبر شاہ ثانی کے وکیل کی حیثیت سے وہاں مقیم تھے۔ میر منشی دفتر خانۂ فارسی مولوی عبدالکریم کے دوست اور ہم خانہ ہونے کی بنا پر مرزا افضل بیگ کو اس قسم کی ریشہ دوانیوں کے بہترین مواقع حاصل تھے۔ چنانچہ غالب کے کلکتہ پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد غالباً انہی کے حسب ایما مولوی عبدالکریم کے ایک عزیز قریب نے غالب کے اپنے الفاظ میں ان کی "تخریب و تذلیل" کی غرض سے بطورِ خاص ایک انجمن کی بنیاد ڈال کر اس کی طرف سے مشاعرے کا اہتمام کیا تھا جس میں فارسی اور اردو کے دو طرحی مصرعے تجویز کر کے دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرنے والوں کو دعوت شرکت دی گئی تھی۔ یہ مشاعرہ یکشنبہ ۸ ماہ جون ۱۸۲۸ء کو منعقد ہوا تھا اور غالب نے اس موقع پر دونوں طرحوں میں غزلیں پڑھ کر عوام و خواص دونوں سے دادِ تحسین حاصل کی تھی۔ مولوی محمد علی خاں کے نام ۲۰ جون ۱۸۲۸ء کو لکھے ہوئے ایک خط میں انھوں نے یہ روداد اس طرح بیان کی ہے۔

"افضل بیگ نام یارے از یاران و معاشران و ہم صحبتانِ راقم بہ صیغۂ وکالت از جانب اکبر شاہ دریں دیار رسیدہ ... با منشی عبدالکریم ہم خانہ است ..... افضل مذکور ..... مرا در سنیاں رافضی

ودر شیعیاں صوفی..... قرار دادہ بود وہم چناں در شعر آوازہ افگند
کہ ایں اسد اللہ غالب تخلص قتیل را نا منزا می گوید و سخنوران کلکتہ را قتیلے
(نمی دہد)..... ہمہ را بر من شورانید و خلقے را با من معارض گردانید۔ یکے از
اقربائے مولوی عبدالکریم خاصۃً از بہر تذلیل و تخریب من انجمنے بنا نہادہ و
مشاعرہ قرار دادہ رقعہ ہا بہ شعرائے کلکتہ نوشت و مرا نیز دعوت کرد۔ ریختہ
گویاں را مصرع ریختہ و پارسی گویاں را مصرع ..... پارسی فرستاد
و فقیر را ہر دو مصرع داد چنانکہ یکشنبہ گذشتہ ہشتم ماہ جون روز
مشاعرہ بود۔ من ہم رفتم و غزل ہائے طرحی ہر دو زبان خواندم۔ بہ
عنایت ایزدی خاص و عام محظوظ گشتند..... خدائے را نازم کہ
ہنگامہ آرا کہ برائے رسوائی و بے آبروئی من موضوع بود باعثِ شہرت
و اظہارِ کمال گردانید[112]"۔

مولوی محمد علی خاں کے نام ہی کے ایک دوسرے خط مرقومہ ۱۴ اگست ۱۸۲۹ء سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی سراج الدین احمد مولوی عبدالکریم کے بھتیجے تھے اور اپنے چچا کے ساتھ وہ خود بھی "اعیان و اشخاص دفتر خانۂ فارسی" میں شامل تھے[113]۔ اگر مذکورہ بالا خط میں "یکے از اقربائے مولوی عبدالکریم" سے فی الواقع یہی مولوی سراج الدین احمد مراد ہیں تو عین ممکن ہے کہ اردو اور فارسی کی دو غزلیں زیر بحث غزلیں ۸ جون ۱۸۲۸ء کے مذکورہ بالا مشاعرے کے لیے کہی گئی ہوں[114] کیوں کہ اس قسم کی کسی معرکے کی محفلِ سخن کے لیے دو ایسے مصرعوں کا تجویز کیا جانا جن میں لسانی اختلاف کے علاوہ اور کوئی فرق نہ ہو ایک دلچسپ تجربہ ہو سکتا ہے۔ ان قیاسات کے درست ہونے کی صورت میں اس امر کا تیقن خود بخود لازم آئے گا کہ اس اولین معرکے میں غالب کی غیر متوقع کامیابی و سرخ روئی کے بعد ہی مولوی سراج الدین احمد ان کے مخالفین کے گروہ سے نکل کر "مخلصین صادق الولا" کے زمرے میں شامل ہوئے ہوں گے اور فریقین میں اخلاص و محبت کے اس تعلق کی بنیاد پڑی ہو گی جس کی گرم جوشی موخر الذکر کی وفات تک بدستور قائم رہی۔

حواشی

۱۔ فسانۂ غالب از مالک رام ص ۱۹، ۴۳ و ۴۷

۲۔ ایضاً فسانۂ غالب ص ۴۱

۳۔ غالب اور حیدر آباد ص ۵۶

۴۔ دستنبو میں جو میرزا یوسف کی وفات کے زمانے میں زیر تسوید تھی، غالب نے لکھا ہے کہ "برادر کہ دو سال از من کوچک است، در سی سال خرد بباد داد و دیوانگی دکالیوگی گزید سی سال است تا کہ آں دیوانۂ کم آزار و بے خروش مست و بے ہوش می زید۔" (کلیات نثر فارسی ص ۳۹۳) ایک شعر میں اسی کیفیت کا بیان اس طرح کیا ہے ؎

دریغ آنکہ اندر درنگ سہ بیست
۳ × ۲۰ = ۶۰
سہ دہ شاد و سی سال ناشاد زیست
۳ × ۱۰ = ۳۰

۵۔ فسانۂ غالب ص ۱۱۱

۶۔ کارنامۂ سروری ص ۱۹

۷۔ نامہ ہائے فارسی غالب ص ۱۰۲

۸۔ اس غزل کا مقطع جس میں نواب ذوالفقار الدولہ والی باندہ کے فرزند اکبر نواب علی بہادر کو دعا دی گئی ہے، درج ذیل ہے ؎

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمند ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

۹۔ جناب مالک رام نے "گل رعنا" میں "نسخۂ شیرانی" اور دیوان متداول کے دو مشترک شعروں میں سے صرف ایک شعر (میرے غم خانے کی قسمت الخ) کی موجودگی کا ذکر فرمایا ہے (گل رعنا، مرتبہ مالک رام ص ۱۸۲) لیکن یہ بیان سہو پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں اشعار جو دیوان کے دونوں متذکرہ

نسخوں کے علاوہ خود موصوف ہی کے شائع کردہ "گل رعنا" کے نسخے میں بھی موجود ہیں (ص ۹۹) درج ذیل ہیں ؎

کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے صید پرسشں ہائے پنہانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

۱۰؎ نامہ ہائے فارسی غالب ص ۳۲ و ۳۳

۱۱؎ نامہ ہائے فارسی غالب ص ۹۴ و ۹۵

۱۲؎ نامہ ہائے فارسی غالب ص ۳۸ و ۴۰

۱۳؎ نامہ ہائے فارسی غالب ص ۸۸

۱۴؎ غالب کی زمانۂ قیام کلکتہ کی تحریروں میں اس سلسلے کے تین شاعروں کا ذکر ملتا ہے "صحبت دوم" اور "صحبت سوئم" کے لیے انھوں نے طرحی زمینوں میں جو غزلیں کہی تھیں، ان دونوں کے علی الترتیب مندرجہ ذیل دو اشعار بطور خاص ہدف اعتراض بنائے گئے تھے ؎

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موے کہ بتاں را زمیاں برخیزد
شور اشکے بہ فشارِ بنِ مژگاں دارم
طعنہ بر بے سر و سامانیٔ طوفاں زدہ گ

(تفصیل کے لیے دیکھئے "نامہ ہائے فارسی غالب" ص ۱۰۴ تا ۱۰۷)

"ماہنامہ "آج کل" دہلی، شمارہ جولائی ۱۹۸۲ء)

منشی نول کشور اور غالب

منشی نول کشور کوئی نامور اور سربرآوردہ ادیب نہیں تھے، پھر بھی ہندستانی ادبیات کی تاریخ میں ان کا مرتبہ کسی مقتدر ترین شخص سے کم نہیں۔ انھوں نے ایک ناشر کی حیثیت سے ہندوستان کے علمی ورثے اور تصنیفی و تالیفی سرمایے کے تحفظ اور نشرواشاعت کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، وہ ان کا نام ابدالآباد تک زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ مشرقی علوم وفنون کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر ان کی تابناک شخصیت کا پرتو نہ پڑا ہو اور جس سے دلچسپی رکھنے والے ان کے نام سے واقف اور ان کے کام کے قدرداں نہ ہوں۔ وہ یکشنبہ ۳ر جنوری ۱۸۳۶ء کو متھرا ضلع کے رکھیڑا نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے متھرا، آگرہ اور اپنے آبائی وطن ساسنی ضلع علی گڑھ میں حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں انھیں انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے ساسنی سے آگرہ بھیجا گیا۔ آگرے کے قیام کے دوران نول کشور نے درسیات کی تکمیل کے علاوہ مضمون نگاری اور صحافت میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اسی دلچسپی کی بنا پر وہ صحافت کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے عزم کے ساتھ پندرہ سولہ سال کی عمر میں بحیثیت مہتمم اخبار "سفیر" آگرہ کے عملے میں شامل ہو گئے۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اخبار "کوہ نور" کے ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے نے انھیں لاہور بلا لیا جہاں انھوں نے کوہ نور پریس اور اخبار دونوں کو ترقی دینے میں اپنی بھرپور انتظامی صلاحیتوں اور غیر معمولی پیشہ ورانہ مہارت کا ثبوت دیا۔ ۱۸۵۷ء میں جب ملک میں ہر طرف بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے اور زندگی کا ہر شعبہ انتشار و اختلال کی زد میں آگیا، تو وہ لاہور سے آگرہ چلے آئے۔ اس وقت وہ عمر کی بائیسویں منزل میں تھے۔

قیام لاہور کے دوران منشی نول کشور کو پریس اخبار اور اس سے متعلق کاموں کے سلسلے میں جو تجربہ ہوا تھا، اس کی بنیاد پر انھوں نے آگرہ میں اپنا پریس قائم کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن حالات کی ناسازگاری کے باعث وہ اسے عملی شکل نہ دے سکے۔ جب بے یقینی کی کیفیت ختم ہوئی تو وہ آگرہ سے لکھنؤ چلے آئے اور یہاں انھوں نے راجہ مان سنگھ کی کوٹھی واقع حضرت گنج میں اس عظیم الشان پریس کی بنیاد رکھی، جسے ابتدا میں "مطبع اودھ اخبار" کے نام سے شہرت حاصل ہوئی اور آج ہم "مطبع نول کشور" یا "نول کشور پریس" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ "اختر شاہنشاہی" (مطبوعہ اختر پریس لکھنؤ طبع ۱۸۸۸ء، ص ۵۲) کے مطابق اس مطبع کا قیام ۲۳ نومبر ۱۸۵۸ء کو عمل میں آیا تھا[۵] اگرچہ اس دن رسمی طور پر مطبع کی بنیاد پڑ گئی تھی، لیکن "اودھ اخبار" اور کتابوں کی طباعت واشاعت کا کام غالباً کچھ دنوں کے بعد شروع ہوا۔ "اودھ اخبار" کی چوتھی اور پانچویں جلدوں کے بعض مسلسل شماروں کے متعلق جو معلومات سامنے آئی ہیں، ان کی روشنی میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہفت روزہ کی حیثیت سے اس کا پہلا شمارہ چہار شنبہ ۵ جنوری ۱۸۵۹ء کو منظر عام پر آیا ہوگا۔ یہ اخبار پریس کا اشتہاری جریدہ بھی تھا اور اردو صحافت نگاری میں ایک نئے عہد کا نقیب بھی اپنی اسی دوگونہ حیثیت کی بنا پر اسے ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں بہت جلد وہ مقبولیت حاصل ہوگئی جس کا یہ واقعتاً مستحق تھا۔

مرزا غالب سے منشی نول کشور کا اولین تعارف غالباً "اودھ اخبار" ہی کے ذریعے ہوا۔ ان کی تحریروں میں اس کا قدیم ترین حوالہ منشی شیو نرائن آرام کے نام ۱۲ نومبر ۱۸۵۹ء کو لکھے ہوئے ایک خط میں ملتا ہے۔ غالب گورنر جنرل اور لفٹنٹ گورنروں کے دوروں کے پروگرام "دربار کی صورت" اور خیر خواہوں کو تقسیم انعام" نیز "کسی نئے بندوبست کے اجرا جیسی اطلاعات وکیفیات سے خود کو باخبر رکھنے کے لیے پابندی کے ساتھ اخبارات کے مطالعے کے عادی تھے۔ چونکہ رسل ورسائل کے محدود ذرائع کی بنا پر ایک شہر کے کسی اخبار کا دوسرے تمام شہروں تک عمومیت کے ساتھ پہنچنا ممکن نہ تھا، اس لیے ان کے بعض احباب اور تلامذہ بھی انھیں حسب موقع مقامی اور غیر مقامی

اخبارات بطور ارمغان بھیجتے رہتے تھے۔ جس زمانے میں منشی شیونرائن کے نام متذکرۂ بالا خط لکھا گیا ہے، گورنر جنرل، لکھنؤ اور قرب وجوار کے اضلاع کا دورہ کر رہے تھے، اور غالب کو ان کے اس دورے کی تفصیلات مطلوب تھیں۔ آرام نے اسی سلسلے میں انھیں "اودھ اخبار" کا ایک شمارہ جس میں غالباً "لکھنؤ کے دربار کا حال" شائع ہوا تھا، عاریتاً ارسال کیا تھا۔ اس کے جواب میں غالب نے انھیں لکھا کہ

"آج یکشنبہ ۱۳ نومبر کو لفافہ اخبار آیا۔ یہ اخبار بھائی ضیاء الدین خاں کے ہاں آتا ہے اور وہ میرے پاس بھیج دیا کرتے ہیں۔ اس کی حاجت نہیں اپنے اور میرے ٹکٹ کیوں برباد کرو۔"

غائبانہ تعارف کے اس مرحلے سے گزرنے کے بعد جولائی ۱۸۶۰ء میں غالباً منشی میاں داد خاں سیاح کی وساطت سے منشی نول کشور اور غالب کے درمیان براہِ راست روابط قائم ہوئے۔ نول کشور کے اولین نامۂ شوق کے جواب میں غالب نے چہارشنبہ ۱۸ جولائی ۱۸۶۰ء کو ان کے نام جو خط لکھا ہے، اس میں بغیر کسی حوالہ و تعارف کے سیاح کے بارے میں یہ جملہ کہ "بہ اقبال نشاں، میاں داد خاں سیاح دعا می فرستم" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مکتوب الیہ اپنے خط میں ان کا تذکرہ کر چکے تھے۔ سیاح ان دنوں لکھنؤ میں مقیم اور منشی نول کشور کے مہمان تھے۔ سفر لکھنؤ سے قبل وہ کچھ دنوں تک دہلی میں قیام کر کے غالب کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو کر ان سے رشتۂ نیازمندی استوار کر چکے تھے۔ اس وقت تک غالب کے اردو دیوان کے دو ایڈیشن دہلی کے مطبع سید الاخبار (اکتوبر ۱۸۴۱ء) اور مطبع دار السلام (مئی ۱۸۴۷ء) سے شائع ہو چکے تھے اور تیسرے ایڈیشن کی طباعت کا معاملہ زیرِ غور تھا جس کے لیے میرٹھ کے ایک ناشر عظیم الدین نے ان سے دیوان کی نقل حاصل کر لی تھی۔ گمان غالب یہ ہے کہ قیامِ دہلی کے دوران سیاح اور غالب کے درمیان اس موضوع پر گفتگو بھی ہوئی ہو گی۔ دہلی سے لکھنؤ پہنچنے کے بعد انھوں نے غالب کو جو پہلا خط لکھا، اس میں دیوان کی اس تیسری اشاعت کے متعلق بھی دریافت کیا تھا۔ غالب نے ۱۱ جون ۱۸۶۰ء کو اس کے جواب میں انھیں لکھا کہ

"دیوان کا چھاپا گیا؟ وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین جس نے
مجھ سے دیوان منگا بھیجا، آدمی نہیں، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے۔ قصہ
مختصر سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اس کے طور پر انطباعِ دیوان نامطبوع ہے
اب میں اس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ
آجائے، تم بھی دعا مانگو۔"

غالب نے دیوان کا یہ نسخہ مارچ ۱۸۶۰ء کے اواخر میں رام پور سے دلی واپس آنے کے بعد "ایک آدمی کے ہاتھ" نواب مصطفیٰ خاں کی وساطت سے عظیم الدین کو بھیجا تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی مطبع مفید خلائق آگرہ کے مالک منشی شیو نرائن آرام نے اس کی طباعت کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کر دی تھی۔ دیوان کی واپسی کا مطالبہ غالباً اسی تحریک کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ سیاح کے نام ۱۱ر جون کو محولہ بالا خط تحریر کیے جانے کے دو ہفتے کے اندر ہی انھیں یہ دیوان واپس مل گیا اور انھوں نے ۲۵ر جون کو اسے بذریعہ پارسل آگرہ روانہ کر دیا۔ اس اثنا میں سیاح کا ایک اور خط موصول ہوا جس کے جواب میں انھوں نے شنبہ ۳۰ر جون ۱۸۶۰ء کو انھیں "بہت خوشی سے" یہ اطلاع دی کہ

"اردو کا دیوان غاصب ناانصاف سے ہاتھ آگیا اور میں نے نورچشم
منشی شیو نرائن کو بھیج دیا۔ یقینِ کلّی ہے کہ وہ چھاپیں گے۔ جہاں تم ہوگے،
ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔"

دیوان سے متعلق دریافت و تجسس کا یہ سلسلہ اس جانب رہبری کرتا ہے کہ غالب کی طرح سیاح بھی اس کے ایک صحیح اور صاف ستھرے ایڈیشن کی طباعت سے دلچسپی رکھتے تھے اس لیے ممکن ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں اپنے طور پر منشی نول کشور سے بھی تبادلۂ خیال کیا ہو۔ قرائن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی اس وساطت سے ہی نول کشور اور غالب کے درمیان براہِ راست روابط کی راہ ہموار ہوئی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں انھوں نے غالب کو پہلی بار ایک اشتیاق آمیز خط لکھا جو اگرچہ محفوظ نہیں تاہم غالب کے جواب کی روشنی میں اس کے مشتملات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غالب نے اپنے اس جوابی مکتوب مورخہ

چہار شنبہ ۱۸ ماہ جولائی ۱۸۶۰ء میں سلسلۂ مراسلت کی اس استواری پر اظہار مسرت میں جس سرگرمی شوق کا مظاہرہ کیا ہے، اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس خط کی صورت میں انھیں منھ مانگی مراد مل گئی ہو یا آبِ حیات کے کسی متلاشی سے خضر نے خود آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرا دیا ہو۔ خط کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

"بنامیزدا مروز سخن می گویم با کسے کہ دیدہ رویش نادیدہ (کذا = ندیدہ) است و دل بمہرش گرویدہ۔ دیدہ دیدار جوے اوست و روے دل بسوے او۔ بر سرِ سوادِ ایں نامہ کہ از دوست بمن رسید، میانِ مردم چشم و سویدائے دل ستیزہ روے داد۔ آں ہمی خواست کہ ہمہ اورا باشد و ایں می جست، تا ہمہ بر باید۔ من در میاں آمدم و از پرخاش باز داشتم تا دہر یکے بہرہ برگرفت و آشتی پدید آمد۔ دیدہ را فروغ مبارک و دل را فراغ ارزانی۔" (کلیاتِ نثرِ غالب مطبعِ چہارم، ص ۲۵۴)

منشی نول کشور کا متذکرہ مکتوب اول غالباً فارسی میں تھا اور انھوں نے غالب سے بھی یہ فرمائش کی تھی کہ وہ اس کا جواب "پارسی آمیختہ بہ تازی" میں تحریر فرمائیں۔ غالب اس سے کئی برس پہلے فارسی میں خطوں کا لکھنا ترک کر چکے تھے کیونکہ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے (ان میں) محنت پژدہی و جگر کاوی کی قوت باقی نہیں رہی تھی"۔ اس کے باوجود انھوں نے اس فرمائش کا احترام کرتے ہوئے اس خط کا جواب اپنی تمام انشا پردازانہ صلاحیتوں کو مجتمع کر کے فارسی ہی میں لکھا اس کے ساتھ ہی ان الفاظ میں متذکرہ صورت حال کی صراحت بھی کر دی کہ

در پارسی زبان بسا سخن گفتہ ام و ہم نامہ ہا نگاشتہ۔ اکنوں کہ دل از ناتوانی پیکاش برنمی تابد، کار بر خود آساں کردہ ام و ہر چہ می باید نبشت در اردو می نویسم، گوی گفتار در نامہ فرسی ہیچ و بہر دو دست می فرستم حاشا کہ در اردو زبان نیز سخن آرائی و خودنمائی آئین باشد۔ آنچہ با نزدیکاں تواں گفت، بہ دوراں نوشتہ می شود۔ مدعا ہمانا گزارشِ مدعاست و دیگر ہیچ

اینک فرمانِ شما پذیرفتم و در نامہ بپارسی آمیختہ بتازی سخن گفتم۔

اپنے انداز مکتوب نگاری کے متعلق اس وضاحت کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی لکھا کہ اگر میری فارسی نثر کے دیکھنے کا اشتیاق ہے تو میرے مطبوعہ "نامہ ہائے نامی" دیکھے جائیں جو لکھنؤ میں بھی یقیناً بعض حضرات کے پاس موجود ہوں گے۔ لکھتے ہیں

"سہ نسخہ در نثر دارم، پنج آہنگ و مہر نیمروز و دستنبو نشگفت کہ در لکھنؤ نیز مردم ایں نامہ ہائے نامی داشتہ باشند۔ اگر ذوقِ نگریستن نگارشِ پارسی دارند، چرا ایں سواد ہا را فراہم نیارند۔"

نول کشور نے اس خط میں غالباً ان سے "اودھ اخبار" کی خریداری قبول کرنے کی بھی درخواست کی تھی۔ غالب نے اس کے جواب میں انھیں لکھا کہ

رسیدنِ اودھ اخبار ازاں سو در ہر ماہ چہار بار و رسیدنِ زرا زیں سو در ہر سال دو بار، اگر منظور دارند، منظور است۔

منشی جی نے غالب سے اودھ اخبار میں اشاعت کے لیے ان کی چند فارسی غزلیں بھی طلب کی تھیں، اس فرمائش کے جواب میں رقم طراز ہیں کہ

"بہ دوستے گفتہ ام تا بہ پارسی غزلے چند نوشتہ دہد۔ ہماں کہ ہمی آرد، بسوئے شما رواں می دارم۔"

اس خط سے اودھ اخبار کی خریداری کے لیے غالب کی آمادگی کے بارے میں جو اطلاع ملتی ہے، وہ اس امر کی آئینہ دار ہے کہ وہ منشی نول کشور اور مطبع اودھ اخبار سے مستقل اور پائدار روابط کی استواری کے خواہشمند تھے۔ اس خط سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس مرحلے پر اخبار کے سالانہ چندے کے سلسلے میں ان کے ساتھ کوئی رعایت برتی گئی تھی لیکن بعد میں رفتہ رفتہ جب ان کے اور منشی نول کشور کے درمیان تعلقات زیادہ مستحکم ہو گئے تو انھیں اخبار کی قیمت کی ادائگی سے مستثنیٰ کر دیا گیا اور صرف ڈاک خرچ وصول کیا جانے لگا۔ اخبار کے لیے مقامی خریداروں سے بارہ روپیہ اور باہر والوں سے پندرہ روپیہ سالانہ وصول کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جناب عتیق صدیقی کی تحریر کے

مطابق ۵ فروری ۱۸۶۲ء کے شمارے میں "ابتدائے نومبر ۱۸۶۱ء سے لغایت آخر جنوری ۱۸۶۲ء" سالانہ چندہ ارسال کرنے والوں کی جو فہرست شائع ہوئی ہے اس میں "نواب اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب" کے نام کے آگے صرف تین روپے کی رقم درج ہے۔[1] اس سلسلے میں خود غالب نے ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کو نواب علاء الدین خاں علائی کے نام لکھے ہوئے ایک خط میں یہ اطلاع فراہم کی ہے کہ

"دو برس سے (منشی نول کشور) ہر مہینے میں چار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں، قیمت نہیں لیتے مگر ہاں اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع پہنچا دیا کرتا ہوں"

اس بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نام اعزازی طور پر اخبار کے اجرا کا سلسلہ ۱۸۶۲ء کے اوائل میں شروع ہوا تھا اور اس سے قبل ڈیڑھ برس تک وہ اس کا مکمل سالانہ چندہ ادا کرتے رہے تھے، ورنہ تین روپے کی معمولی رقم دو قسطوں میں ادا کرنے کی شرط فہم سے بالاتر معلوم ہوتی ہے۔ بعد کے زمانے کے مختلف خطوط سے جن میں اس اخبار کا ذکر آیا ہے، یہ پتا چلتا ہے کہ یہ اخبار انھیں اواخر عمر تک برابر ملتا رہا اور وہ پابندی اور دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے رہے۔ مرزا تفتہ کو ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

"منشی (نول کشور صاحب) کو میرا سلام کہنا۔ آج یکشنبہ ہے، اخبار کا لفافہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ ہر ہفتے پنجشنبہ حد جمعہ کو پہنچتا ہے۔"

مکتوب بنام میر ولایت علی مہتمم مطبع عظیم المطابع پٹنہ مورخہ ۴ اپریل ۱۸۶۵ء میں رقم طراز ہیں:

از روئے اودھ اخبار لکھنؤ "بوستان خیال" کا ترجمہ مسمّی بہ "پرستان خیال" آپ کے مطبع میں آمادۂ انطباع (ہونا) بلکہ دو جلدوں کا منطبع ہو جانا اور دونوں نسخوں کا بہ قیمت ایک روپیہ کے بہ شرط ارسال محصول ڈاک ہاتھ آنا معلوم ہوا۔

منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے نام دو شنبہ ۱۶ شعبان ۱۲۸۳ھ (۱۷ دسمبر ۱۸۶۶ء)

کے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"اودھ اخبار میں ایک قصیدہ مولوی غلام امام (شہید) کا دیکھا..... مدح مختار الملک میں متضمن استدعائے مسکن وسیع۔ پھر چھینے بعد اسی اودھ اخبار میں یہ خبر دیکھی کہ نواب نے مسکن تو نہ بدلا، مگر تیس روپیہ مہینہ بڑھا دیا۔ اسی اخبار میں پھر دیکھا گیا کہ ایک صاحب نے مولوی غلام امام کے کلام پر اعتراض کیا ہے اور ان کے شاگرد وضیع تخلص نے اس کا جواب لکھا ہے۔"

میاں دادا خاں سیاح کو ۱۳ر مارچ ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"صاحب! میں نے اودھ اخبار میں دیکھا کہ چھوٹے صاحب (غلام بابا خاں) مقدمہ جیتے اور بمبئی کے صاحبوں میں ان کی افزائش جاہ و جلال و تعظیم و توقیر کمال ہوئی۔"

منشی نول کشور اور مرزا غالب کے درمیان جولائی ۱۸۶۰ء میں خطوط کے باہم تبادلے کے ساتھ براہ راست رابطے اور تعلقات کا جو دور شروع ہوا، اس کے پہلے ایک سال کی روداد کے بارے میں تمام ذرائع خاموش ہیں۔ اس عرصے میں منشی شیو نرائن آرام کے مطبع مفید خلائق کے بجائے محمد حسین خاں کے مطبع احمدی دہلی سے امو جان کے زیر اہتمام دیوان اردو کا تازہ ایڈیشن بیسویں محرم الحرام ۱۲۷۸ھ (۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء) کو منطبع ہو کر منظر عام پر آ گیا۔ غالب نے میر مہدی مجروح کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ

"کلیات اردو کا چھاپا تمام ہوا، اغلب ہے کہ اسی ہفتے میں یا اسی مہینے میں ایک نسخہ بسبیل ڈاک تمھیں پہنچ جائے گا۔ کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بندھ گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔ قاطع برہان کے خاتمہ میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔ اگر مقدور مساعدت کرے گا تو میں بے شرکت غیر اس

کو چھپوائیں گا۔ مگر یہ خیال محال ہے، میرے مقدور کی تیاری کا حال مجتہد العصر (میر سرفراز حسین) کو معلوم ہے۔

اس خط کی تحریر کے وقت تک اگرچہ دیوان اردو کا چھاپا تمام ہو چکا تھا لیکن اس کی کوئی جلد شاید مرزا غالب کے پاس نہیں آئی تھی۔ جب حقِ تصنیف کی ایک جلد انھیں ملی تو وہ اس کی کتابت و طباعت سے بے حد مایوس ہوئے۔ چنانچہ ۸ راگست ۱۸۶۱ء کو مجروح کے نام کے خط میں انھوں نے ان الفاظ میں اس کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

"دیوان اردو چھپ چکا ہے۔ ہائے! لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا، حسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحبِ دیوان کو اس طرح پکارتا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں کاپی نگار اور تھا متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے، حق تصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں، یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھوا، وہ چھپا بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔

اس خط میں غالب نے "لکھنؤ کے چھاپے خانے" یعنی مطبع نول کشور کی مطبوعات کے حسنِ کتابت و طباعت کے بارے میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں اور دلی کے مطابع کو جس طرح ہدفِ ملامت بنایا ہے، اسے پڑھ کر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے دل میں مطبع نول کشور سے اپنی بعض کتابوں کی اشاعت کی خواہش شدّت کے ساتھ سر اٹھا رہی تھی۔ پچھلے خط سے یہ بات ہمارے علم میں آ چکی ہے کہ اس وقت ان کے پاس کم از کم دو کتابیں یعنی "کلیاتِ نظم فارسی" اور "قاطع برہان" طباعت کے لیے تیار تھیں اور انھیں چھاپنے کی تدبیریں بھی ہو رہی تھیں وہ اس کوشش میں برابر سرگرم تھے۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد جمعہ ۴ ر اکتوبر ۱۸۶۱ء کے خط میں مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں کہ

"برہان قاطع" کے اغلاط بہت نکالے ہیں۔ دس جزو کا ایک رسالہ لکھا ہے، اس کا نام "قاطع برہان" رکھا ہے۔ اب اس کے چھاپے کی فکر ہے۔ اگر یہ مدعا حاصل ہو گیا تو ایک جلد چھاپے کی تم کو بھیج دوں گا۔"

اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ تا دمِ تحریر ان کی اس خواہش کی تکمیل کا کوئی ڈول نہ بندھ پایا تھا۔ بعد میں یہ رسالہ اور کلیات نظم فارسی دونوں کتابیں مطبع نول کشور سے شائع ہوئیں۔ غالب نے سید بدر الدین کاشف کے نام ایک خط میں ان کی طباعت کی روداد اس طرح بیان کی ہے۔

۱۸۶۲ء میں یعنی سالِ گزشتہ "قاطع برہان" چھپی۔ پچاس جلدیں میں نے مول لیں۔۔۔۔ فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا جب چھپا تھا۔ پھر نہیں چھپا مگر ہاں سالِ گزشتہ میں منشی نول کشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں یعنی کوئی مصرعہ میرا اس سے خارج نہیں اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں، ہاتھ آجائے تو پنسٹھ بھیج کر بیس جلدیں منگوا لوں"۔

"قاطع برہان" خاتمۃ الطبع کے مطابق ۲۰ رمضان ۱۲۷۸ھ (مطابق ۲۲ مارچ ۱۸۶۲ء) کو چھپ کر تمام ہوئی تھی۔ دیوان کی طباعت کا کام اس کے تقریباً چودہ مہینے بعد ماہ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ مطابق مئی ۱۸۶۳ء میں مکمل ہوا۔ یہ خط بظاہر اسی زمانے میں لکھا گیا ہے چونکہ اس خط میں "قاطع برہان" کے زمانہ طباعت کے سلسلے میں ۱۸۶۲ء کی تعبیر سالِ گزشتہ سے کی گئی ہے اس لیے دوسری جگہ بھی سال گزشتہ سے یہی سنہ مراد لے کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ منشی نول کشور نے یہ دیوان شہاب الدین احمد خاں سے ۱۸۶۲ء میں حاصل کیا تھا۔ لیکن چونکہ غالب عموماً سال ہجری کے مطابق حساب کرتے

سکے عادی ہیں، اس لیے ان دونوں مقامات پر سال گزشتہ سے ۱۲۷۸ھ مراد لینا زیادہ مناسب ہوگا جس کی ابتدا غالب کے بیان کے مطابق "بقول تعزیہ داراں" پنجشنبہ ۱۱ جولائی ۱۸۶۱ء کو اور "از روئے دوج" چہار شنبہ ۱۰ جولائی ۱۸۶۱ء کو ہوئی تھی۔ گویا مرزا تفتہ کو ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۲ء کو لکھے ہوئے محولہ بالا خط کی تحریر کے کچھ دنوں بعد ہی ان دونوں کتابوں کی طباعت کی ایک مناسب اور خاطر خواہ سبیل نکل آئی تھی۔ یکم جنوری ۱۸۶۲ء کے "اودھ اخبار" میں ان دونوں کتابوں کے اشتہارات بھی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ ۱۸۶۱ء کے ختم ہوتے ہوتے یعنی زیادہ سے زیادہ جمادی الآخر ۱۲۷۸ھ تک ان کی طباعت کے سلسلے کے تمام معاملات طے پا چکے تھے۔ اودھ اخبار کے مذکورہ بالا شمارے میں کلیات کا اشتہار اردو میں اور قاطع برہان کا اشتہار فارسی میں شائع ہوا ہے۔ کلیات کے اشتہار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس کی کتابت و طباعت کا کام شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ اشتہار اخبار کے صفحہ اول پر چھاپا گیا ہے اور اس اشاعت سے متعلق تمام ممکنہ تفصیلات کو محیط ہے۔ چند غیر اہم جملے حذف کر کے یہ اشتہار سطور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"...... آویزہ گوش جہاں ہو، نزدیک و دور عیاں ہو کہ نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے۔ نقش و نگار اس دل آرام رنگین ادا کا عن قریب شروع ہوا چاہتا ہے۔ اقسام سخن پر مشتمل ہے ہر ایک شعر فرد کمال دلکشا کا مل ہے عالی مضامین قصائد لاجواب، رنگین غزلیں انتخاب کہ انھیں دیکھ ظہیر کا کمال بھول جائیے نظیری کی شوکت کبھی خیال میں نہ لائیے، مثنوی کی جادو بیانی میں جائے گفتگو نہیں، سحر حلال زلالی کی اس کے سامنے آبرو نہیں۔ رباعیوں کو پیکر سخن کے اربع عناصر کہیے، آب دار قطعات کو قطعات جواہر کہیے ہر بیت شاہد ماہ سیمائے معنی کا گھر ہے، ہر مصرع قدِ موزوں سے بڑھ کر ہے۔ دس ہزار چار سو کئی اشعار ہیں کہ سب سلک گوہر شاہوار

ہیں خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست بڑے کتب خانہ کا ہاتھ آیا، جس کو نواب ضیاء الدین خاں صاحب دہلوی نے جد و جہد تمام سے جمع فرمایا۔ مقبولِ آفاق کو تعریف کی حاجت نہیں، آفتاب کی صفات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظم کی بے مثالی آشکار ہے، عالم کو ان کی استادی کا اقرار ہے۔ اس زمانے میں سحبانِ ثانی ہیں، جوابِ انوری و خاقانی ہیں ہر نقطہ ان کے قلم کا اختراعِ کمال ہے، جو سخن زبان سے نکلا، سحرِ حلال ہے۔ ایسی نادر چیز کہاں میسر آتی ہے کس خوش نصیب کی یہ امید بر آتی ہے دیکھیے ہم درِ نایاب کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں موتی کوڑیوں کے مول لٹائے دیتے ہیں۔ سب کتاب تقریباً چالیس جزو میں چھپے گی، بعض مقام مناسب پر تصویر مصنف کھنچے گی۔ شروع طبع میں قیمت بھیجنے والے سے ۳ (تین روپے چار آنے) کو پائیں گے، چھپ چکنے کے بعد پورے ۵ (پانچ روپے) مقرر ہو جائیں گے۔ غالباً اہل ہنر سنتے ہی اہتزاز میں آئیں گے، چھپنے تو دو، ہاتھوں ہاتھ اٹھالے جائیں گے۔ اشتہار دینے کا یہ سبب ہے صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ درخواست بھیجنے والوں کو اطمینان یکسر رہے گا، پہلے ان کا استحقاق مدِّ نظر رہے گا۔ اگر ابھی سے طلب گار ہوں تو قیمت کے حصہ دار ہوں۔ فقط"

قاطع برہان کا اشتہار کلیات کے اشتہار کے مطابق شائع ہوا ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس کی طباعت کا کام اختتام کے قریب پہنچ چکا تھا، اور دو ہفتے کے اندر اس کے منظرِ عام پر آجانے کی امید تھی۔ اشتہار کے خاص خاص مندرجات درج ذیل ہیں:

"ارباب فرہنگ و ہنر را مژدہ باد...... کہ...... اعلیٰ نقادِ جوہر تحقیق، روشن گر آئینۂ تدقیق، آموزگارِ جلیل المناقب، نواب اسد اللہ خاں غالب...... پائے غزل کے برہان از تمام کتاب چیدہ ہنجارِ قامت دانموده وجاہاے کہ رہوار تش سکندری خوردہ، عنانِ آگہی برمنارہ سودہ

حاصل کرد اتش بر آورده باصلاح پرداخت وہمہ را جمع نمودہ رسالہ مختصر ساخت ..... طبع ایں کتاب کہ ازدہ جز بیش نباشد، قریب اختتام رسیدہ۔ یقین کہ در دو ہفتہ طیار گردد ..... ہر کرا شوق دامنِ دل کشد، بہ خریداری پردازد و مناسب ست کہ درخواست فرستادہ از پیش ترا آگاہ سازد۔ رعایتِ سبق بمندگان مد نظر شد، ایں زماں یک روپیہ قیمتش مقرر شد۔ فقط[25]

کلیات کا اشتہار یکم جنوری کے بعد کم از کم اکتوبر ۱۸۶۲ء تک دوبارہ کسی پرچے میں شائع نہیں ہوا، اس کے برخلاف قاطع برہان کا اشتہار ۹ اپریل تک برابر مختلف شماروں میں شائع ہوتا رہا۔ چونکہ خاتمۃ الطبع کے مطابق کتاب ۲۲ مارچ کو چھپ کر تیار ہو گئی تھی اس لیے ۲۶ مارچ اور بعد کے شماروں میں اسے "اشتہار اختتام قاطع برہان" کے زیر عنوان شائع کیا گیا ہے۔ ان شماروں میں "یقین کہ در دو ہفتہ طیار گردد و قابل تماشائے اولی الابصار گردد" کو حذف کر کے یہ خوش خبری سنائی گئی ہے کہ "اینک تو یدگوشِ سخن سنجان رسانم کہ طبعش بانجام رسیدہ۔"

قاطع برہان کی اشاعت کے زمانے تک ایک منفرد شاعر اور ممتاز ادیب کی حیثیت سے غالب کی شہرت ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچ چکی تھی۔ مزید برآں اس کتاب اور کلیاتِ نظم فارسی کے اعلانِ طباعت کے ساتھ ان کا نام مطبع اودھ اخبار کے حلقۂ مصنفین میں بھی شامل ہو گیا تھا۔ اس لیے ان سے متعلق خبریں اور ان کے نتائجِ فکر و قلم بھی اخبار میں نمایاں طور پر شائع کیے جانے لگے تھے۔ چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء کے شمارے میں "نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب" کے عنوان سے ایک خبر شائع ہوئی ہے جو ملکۂ وکٹوریہ کے شوہر پرنس البرٹ (متوفی ۱۴ دسمبر ۱۸۶۱ء) کی تعزیت کے سلسلے میں ان کے اظہارِ تاثرات سے تعلق رکھتی ہے۔ اس خبر کا ذریعہ نامعلوم ہے لیکن اس کے بیان کے لیے جو طویل تمہید باندھی گئی ہے، اس کے بعض مندرجات واضح طور پر اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ یہ تمام تفصیلات منشی نول کشور کے نام اپنے کسی خط میں خود

غالب ہی نے فراہم کی ہوگی۔ تقریباً ایک سال کے بعد اودھ اخبار ہی میں شائع شدہ ان کا ایک اور خط جو آئندہ سطور میں پیش کیا جائے گا، اس قیاس کو تقویت بخشتا ہے۔ خبر کا مکمل متن حسب ذیل ہے۔

"سب جانتے ہیں، کچھ حاجت دلیل نہیں، کہ آج ہندوستان میں ان کا عدیل نہیں فصاحت و بلاغت میں سحبانِ ثانی ہیں۔ فن شعر میں جواب انوری و خاقانی ہیں۔ زمین سخن کو آسمان پر پہنچایا، ہر نقطے کو اختر اوج معانی بنایا۔ زور فکر ان کا جہاں میں مشہور ہے، نتائج طبع عالی کا آوازہ دور دور ہے، جناب جہانبانی مآب ملکہ معظمہ ہند و انگلینڈ کی مداحی میں وہ پایۂ بلند و مرتبۂ ارجمند پایا کہ ابتدائے عمل داری سرکار سے کسی ہندوستانی کے لیے اس کا دسواں حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کیفیت نواب ممدوح نے خوب لکھی ہے اپنی کتاب دستنبو میں مفصل بیان کی ہے، آگے ایک قصیدہ ملکہ معظمہ کی شان میں کہا تھا، وہاں تو ہر کمال کی قدردانی ہے، کھلا ہوا بابِ فیض رسانی ہے، جب فیض یاب سماعت ہوا، منظور نگاہِ مرحمت ہوا۔ جو دو نوال کی طرف ہمت آئی، صلۂ شاہانہ دینے پر طبیعت آئی۔ فروری ۱۸۵۷ء میں جناب رسل کلرک صاحب بہادر نے مصنف کو انگریزی چٹھی لکھی۔ ولایت سے ڈاک میں پہنچ کر اس نوید سراپا امید سے خبر دی کہ تمھارے قصیدے کے انعام کا مقدمہ زیر تجویز ہے، عن قریب خطاب پاؤ گے، بعد صدور حکم انڈیا گورنمنٹ اس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ سنہ مذکور میں سرزمین ہند پر آسمان ٹوٹا، فوج حوادث نے بالکل متاعِ امید کو لوٹا، بہتیرے بے گناہ یوں زیر آسیائے گردوں پسے، جس طرح چکی کے پاٹ تلے گیہوں پسے۔ کیا آغاز تھا کیا انجام ہوا کہ ہر متمنی صید بھی ناکام ہوا۔ نواب صاحب کا وہ معاملہ گویا خواب تھا۔

جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا

عجب نہیں کہ پرورشِ سلطانی پھر توجہ فرمائے، عین حالتِ یاس میں لطفِ خسروانی سے امید بر آئے۔

اس تقریب میں ایک ذکر اور سنیئے کہ ان دنوں جب تعزیتِ شاہزادۂ عالی پائے گاہ عالم گیر تھی، دہلی میں ایک ورق بخطِ انگریزی لکھا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرا ورق سادہ پیش گاہِ حکام سے مشاہیرِ شہر کے پاس پہنچا، ہر ایک نے اپنا نام لکھ دیا۔ نواب صاحب نے اس راہ سے کہ صاحب سخن ہیں، مدحت سرائے ملکۂ زمن ہیں یہ شعرِ فی البدیہہ کہا ہوا لکھ کر مہر کر دی ؎

شاہ عالی گہر و گوہر پاکش صد حیف
وینکہ ناچار سپردند بخاکش صد حیف [۵۲]

اس خبر کی اشاعت کے چھ ہفتے بعد ۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء کے شمارے میں غالب کا ایک سیاسی نوعیت کا مضمون شائع ہوا جو "آفتابِ عالم تاب" سے نقل کیا گیا تھا، جناب عتیق صدیقی کے الفاظ میں "اس مضمون کی محرک ہندستان پر افغانستان کے حملے کی تیاریوں کی افواہیں تھیں جنھیں پڑھ کر اور سن کر ہندوستانی عوام ذہنی انبساط محسوس کرتے تھے" [۵۳] غالب نے جو کچھ ہی دنوں پہلے "سرزمین ہند میں موج زن دریائے خوں کے ایک عینی شاہد تھے" پیشِ نظر مضمون میں اس قسم کی خوش فہمیوں کو ناعاقبت اندیشی سے تعبیر کرتے ہوئے اپنے ہم وطنوں کو عہد جدید کی ترقیات کی طرف توجہ دینے اور ان کی برکات سے مستفید ہونے کا مشورہ دیا ہے کم سے کم دو ممتاز اخباروں میں شائع ہونے کے باوجود یہ مضمون غالباً اپنی غیر ادبی نوعیت کی بنا پر غالب کے کسی مجموعہ نگارشات میں جگہ نہ پا سکا اور پہلی بار عتیق صدیقی صاحب کے ایک مضمون "ذکرِ غالب۔ ۱۸۶۲ء کے اودھ اخبار میں" مشمولہ سہ ماہی "غالب نامہ" شمارہ ۳، ۴ کی وساطت سے منظرِ عام پر آیا ہے یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اس کے بارے میں مدیرِ اخبار کے تمہیدی "نوٹ" کے چند جملے جن کا تعلق براہِ راست غالب کی ذات

سے ہے اور جن سے اس کی غایتِ نگارش اور اخبار میں اشاعت کے محرکات کی وضاحت ہوتی ہے، سطورِ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔ اس نوٹ میں "صحائف اخبار" کی افسانہ طرازی اور ہندوستانیوں کی کم عقلی پر اظہارِ افسوس کے بعد لکھا گیا ہے کہ :۔

"آج کل دانائے روزگار، سر آمد اولی الابصار، ارسطو فطرت، فلاطون فطنت، جناب والاشان، عالی مناقب مرزا اسد اللہ خاں غالب نے جن کی سلامتِ ذہن مستقیم پر قسم کھائیے۔ استقامت رائے سلیم کے صدقے جائیے، نافہموں کی فہمائش میں ایک نثر تحریر فرمائی ہے، ہمارے مضمونِ خیالی سے توارد ہوا، ایسی تقریر فرمائی (ہے) ہم اس کو درج اخبار کرتے ہیں اور اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں"[۹]

اودھ اخبار میں یہ مضمون "نثر" ہی کے زیرِ عنوان شائع ہوا ہے۔

"قاطع برہان" کے اختتام طباعت کی خوشخبری جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے اس مضمون کی اشاعت سے تقریباً ایک ماہ پہلے سنائی جا چکی تھی۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعلان کے باوجود کتاب اواخر اپریل تک پوری طرح تیار نہیں ہو پائی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ۵ مئی ۱۸۶۲ء کو اپنے شاگرد عزیز میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو جو اس وقت لکھنؤ میں مقیم اور مطبع نول کشور سے وابستہ تھے لکھا تھا کہ :

"قاطع برہان کے اجزا کی جلدیں بندھ گئی ہیں یا نہیں! اگر بندھ گئی ہوں تو جناب منشی صاحب سے کہہ کر جو پچاس جلدیں میں نے لی ہیں ان میں سے ایک جلد لے کر ..... قبلہ و کعبہ جناب مجتہد العصر کی خدمت میں حاضر ہو اور میری طرف سے کورنش عرض کرو اور کتاب نذر کرو"[۱۰]

اس خط کے لکھنؤ پہنچنے تک جلد سازی کا کام مکمل ہو چکا تھا چنانچہ نمونے

کی ایک جلد ۱۵ مئی ۱۸۶۲ء سے قبل غالب کو مل گئی تھی۔ اسی تاریخ کو میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"قاطع برہان کا چھاپا ختم ہو گیا۔ ایک جلد بطریق نمونہ آگئی میں نے پچاس جلدوں کی درخواست پہلے سے دے رکھی ہے۔ اب پچاس روپیے بھیجوں، تو پچاس جلدیں منگواؤں۔ دیکھئے نو من تیل کب میسر ہو اور رادھا کب ناچے۔"

نمونے کی اس ایک جلد کے پہنچنے اور قدر بلگرامی کے جوابی مکتوب سے قبلہ و کعبہ کی نذر کی رسید نیز ان کا "مہری و دستخطی توقیع" وصول پانے کے بعد غالب نے انھیں مطبع سے مزید ایک جلد حاصل کر کے مفتی میر عباس صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کی ہدایت کی اور لکھا کہ

منشی صاحب سے کہہ دینا کہ پچاس میں سے تین جلدیں میں نے پائیں اب قیمت کا روپیہ بھیج کر سینتالیس اور منگائے لیتا ہوں۔

منشی عبد الغفور سرور کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پچاس جلدوں کی قیمت ادا کرنے کے لیے رقم کی فراہمی کی یہ مہم ماہ جون کے اواخر تک یا تو سر ہو چکی تھی یا جولائی کے اوائل میں اس کے سر ہو جانے کی کوئی قطعی صورت نکل آئی تھی، اس خط میں انھوں نے اطلاع دی تھی کہ :۔

قاطع برہان کے مجلدات جو بموجب توقیع خریداری میری ملک ہیں، وہ اول جولائی میں میرے پاس اور ان میں سے دو مجلد آخر جولائی میں آپ کے پاس پہنچیں گے۔

برہان قاطع کی طباعت کا مرحلہ تو چند مہینوں کے اندر طے ہو گیا لیکن کلیات نظم فارسی کی کتابت و طباعت بعض وجوہ کی بناء پر برابر تعویق میں پڑتی رہی۔ غالب کے متعدد خطوط اس امر کے شاہد ہیں کہ وہ اپنی کتابوں کی طباعت میں کتابت کی صحت و نفاست پر بالخصوص اور ان کی مجموعی آرائش و زیبائش پر بالعموم بہت زیادہ

زور دیتے تھے اور صاحبانِ مطبع کو بار بار ان امور پر توجہ مرکوز رکھنے کی ہدایت کرتے رہتے تھے۔ غالباً منشی نول کشور سے بھی انھوں نے اسی شرط کے ساتھ معاملات طے کیے تھے اور انھیں کلیات کا ایک ایسا قلمی نسخہ فراہم کیا تھا جو ان کے تمام کلام کا جامع اور کاتبوں کے دخل و تصرف سے پاک تھا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں کو جنھوں نے غدر کے بعد دوسری مرتبہ محنت کرکے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ مرتب کیا تھا، اپنی اس متاعِ عزیز کو منشی نول کشور کی طلب پر ان کے حوالے کرنے میں تامل تھا۔ انھیں اندیشہ تھا کہ یہ نسخہ اگر ضائع ہو گیا تو آئندہ اس سارے کلام کا یکجا کرنا بہت دشوار ہوگا۔ غالب نے جس طرح منت سماجت کے ذریعہ انھیں اس قسم کے توہمات بے جا اور اندیشہ ہائے دور دراز سے صرفِ نظر کرکے یہ مجموعۂ کلام منشی صاحب کے سپرد کر دینے پر آمادہ کیا تھا، اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل خط سے کیا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں :-

آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ ہر روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے آپ کا کھانا ہضم نہ ہوتا ہو، یہ بھی نہیں، پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ــــ ایک جلد ہزار جلد بن جائے، میرا کلام شہرت پائے، میرا دل خوش ہو، تمھاری تعریف کا قصیدہ اہلِ عالم دیکھیں، تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں۔ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان، کتاب کیوں تلف ہوگی، احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رام پور جاؤں گا، اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دوں، وہ یہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے؟ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے تو کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل سے لے کر بھیج دو، اگر

وہ نہ دیں تو میں کیا کروں؟ اگر دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو ناتمام پھر ناقص۔ بعض بعض قصائد اس میں سے اوروں کے نام کر دیے گئے ہیں اور اس میں اسی ممدوح سابق کے نام پر ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان جو یوسف مرزا لے گیا ہے، اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود تیسری یہ کہ سراسر غلط، ہر شعر غلط، ہر مصرع غلط یہ کام تمھاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا، اور تمھارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں احتمالِ نقصان وہ بھی از روئے وسوسہ و وہم، اس صورت میں تلافی کا کفیل، جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں۔ بہر حال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں، اور طلب اس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔ رحم و کرم کا طالب، غالب۔"

ظاہر ہے کہ جو نسخہ ہر اعتبار سے دوسرے تمام دستیاب نسخوں سے فائق و ممتاز تھا اور جس کے حصول کے لیے غالب کو رحم و کرم کی دریوزہ گری کی سطح تک نیچے اترنا پڑا تھا اس کی بہ حفاظت واپسی کے لیے انھوں نے کیسی کیسی پیش بندیاں نہ کی ہوں گی اور اپنی عادت کے موافق صحتِ کتابت اور حسنِ طباعت پر کس قدر اصرار نہ کیا ہوگا۔ منشی نول کشور نے ان ہدایات و خواہشات کے پیشِ نظر کلیات کی کتابت، تصحیح اور طباعت کی ذمہ داری یقیناً مطبع کے بہترین کارکنوں کے سپرد کی ہوگی۔ لیکن سوئے اتفاق سے ساٹھ صفحات کا چھاپا تمام ہونے کے بعد کاتب چھٹی لے کر اپنے گھر چلا گیا اور مولوی ہادی علی مصحح بیمار پڑ گئے۔ غالب نے ۱۵ مئی ۱۸۶۲ء کے خط کے بالاخط میں میر مہدی مجروح کو اس صورت حال سے باخبر کرتے ہوئے لکھا۔

"کلیات کے چھاپے کی حقیقت سنو۔ ساٹھ صفحات چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہو گئے۔ کاپی نگار رخصتی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھیے کب چھاپا شروع ہو۔"

کلیات کی طباعت کے کام میں یہ تعویق جو متذکرہ ناگہانی اسباب کا نتیجہ تھی، غالب کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور مایوس کن تھی۔ ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔

اس لیے وہ چاہتے تھے کہ یہ کام جلد از جلد ان کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ دوسری طرف منشی نول کشور اپنی ایک ناقابلِ عبور مجبوری اور احساسِ ندامت کی وجہ سے شاید بالکل خاموش تھے۔ غالب نے اس سکوت کو توڑنے کے لیے قدر بلگرامی کی وساطت کا سہارا لیا اور ۵ مئی ۱۸۶۲ء کے خط میں انھیں لکھا۔

> اس رقعہ کی تحریر سے مراد یہ ہے کہ جناب منشی صاحب سے میرا سلام کہیے اور یہ رقعہ ان کو پڑھا کر عرض کیجیے کہ غالب پوچھتا ہے کہ فارسی کے کلیات کا چھاپا ملتوی ہے یا جاری ہے؟ ملتوی ہے تو کب تک کھلے گا؟ جاری ہے تو تصحیح کس طور پر ہے؟ قصیدۂ ثنا اور تاریخِ کلیات کا مطبع میں پتہ لگا ہے یا نہیں؟
>
> منشی صاحب سے چاروں سوالوں کا جواب اور مولوی ہادی علی صاحب کا جو حال معلوم ہو، وہ بھی ضرور لکھنا اور اس خط کا جواب جلد بھیجنا"

معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے جواب میں چھاپے کا کام جلد ہی دوبارہ شروع ہونے اور اختتام سال تک مکمل ہو جانے کی توقع ظاہر کی گئی تھی اور اس کی تاریخ انطباع نظم کر کے بھیجنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس کے جواب میں ۲۲ مئی ۱۸۶۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> کلیات کے انطباع کی تاریخ میں کیوں لکھوں؟ اہلِ مطبع کو خدا منشی صاحب کے سایۂ عطوفت میں سلامت رکھے، کہہ لیں گے۔ چھاپا ۷۸ (۱۲۷۸ھ) میں شروع ہوا، ۷۹ (۱۲۷۹ھ) میں تمام ہوگا۔ مولوی ہادی علی صاحب کے مطبع میں آنے کا حال تم لکھو اور کلیات کے کاپی نگار کے آنے کا بھی حال معلوم کر کے لکھو۔

متذکرہ بالا یقین دہانی کے باوجود تعطّل کی یہ کیفیت بدستور مزید کچھ دنوں تک برقرار رہی اور غالب کا ذہن جو "اضمحلال قوٰی" اور "استیلائے ضعف" کے باعث ہر لمحہ "فکرِ مرگ اور غمِ عقبیٰ" سے پراگندہ و منتشر رہنے لگا تھا، کشمکشِ انتظار سے

نومیدی جاوید کی سمت میں سفر کرنے لگا۔ نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ۱۹ جون

۱۸۶۲ء کو لکھے ہوئے ایک خط میں انھوں نے اپنی اس مایوسی کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے

"کلیات کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا"

کلیات کا قلمی نسخہ جس سے پریس کے لیے کاپی لکھی جارہی تھی، رضا لائبریری رام پور

کے لوہارو کلیکشن میں محفوظ ہے۔ اس کی صحیح حالت میں موجودگی اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ کتابت

کا کام کسی انتہائی سلیقہ مند کاتب کے سپرد کیا گیا تھا[۵] اندازہ یہ ہوتا ہے کہ منشی نولکشور

غالب کی بے تابی اور فکر مندی کے باوجود کسی دوسرے شخص سے یہ کام لینے کے لیے

تیار نہ تھے کیونکہ اس صورت میں اصل نسخے کے خراب ہونے اور دو خطوں میں کتابت کی

وجہ سے مطبوعہ نسخے کی نفاست پر حرف آنے کا احتمال تھا اور یہ دونوں صورتیں نواب

ضیاء الدین احمد خاں اور غالب کی ناخوشی، مطبع کی بدنامی اور اپنی شرمساری کے خیال

کی بنا پر ان کے لیے بہر حال ناقابل قبول تھیں۔ چنانچہ کتابت و تصحیح کتابت اور اس کے

نتیجے میں چھاپے کا کام کاتب اور مصحح کے اپنی ذمہ داریاں دوبارہ سنبھال لینے تک برابر

ٹلتا رہا۔ حتیٰ کہ ایک سال چار مہینے سے بھی کچھ زیادہ کے وقفے کے بعد ۱۲ مئی ۱۸۶۳ء کے

اودھ اخبار میں پہلی بار یہ اعلان کیا گیا کہ کلیات کی طباعت پایۂ اختتام کو پہنچ چکی ہے

یہ اشتہار الفاظ اور جملوں کے معمولی سے فرق اور رد و بدل کے ساتھ بعینہٖ یکم جنوری

۱۸۶۰ء کے اخبار میں شائع شدہ اشتہار کی نقل تھا۔ موقع اور محل کی مناسبت سے

اس میں جو تبدیلیاں کی گئیں تھیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

یکم جنوری ۱۸۶۲ء کے اشتہار میں ناظرین کو اس "مژدہ" کے ساتھ مخاطب

کیا گیا تھا:

آویزۂ گوش جہاں ہو، نزدیک و دور عیاں ہو کہ نواب مرزا اسد اللہ

خاں صاحب غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے

نقش و نگار اس دل آرام رنگین ادا کا عن قریب شروع ہوا چاہتا

ہے۔

۱۳ر مئی ۱۸۶۳ء کے اشتہار میں اس منصوبے کی تکمیل پر یہ بشارت سنائی گئی کہ :-

نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہو کر انجام کو پہنچا، نقش ونگار اس دل آرام رنگیں ادا کا اختتام کو پہنچا۔

اشتہار مطبوعہ یکم جنوری ۱۸۶۳ء کا آخری حصہ جو "سب کتاب چالیس جز پر چھپے گی" سے شروع ہو کر "کی قیمت کے حصہ دار ہوں گے" پر ختم ہوتا ہے، اس دوسرے اشتہار کے لیے از سر نو لکھا گیا ہے۔ اس کی بدلی ہوئی شکل حسب ذیل ہے۔

"تمام کتاب ۴/۳۵ جز میں چھپ کر تیار ہے اور مقام مناسب پر تصویر مصنف بھی یادگار ہے۔ سابق میں سوائے محصول پیشگی قیمت ہے (تین روپے چار آنے) قرار دی تھی اور بعد ختم کتاب ہے (پانچ روپے) درج اخبار کی تھی اب چونکہ رفاہِ عام منظور ہوا، قیمت کا گھٹانا ضرور ہوا لہٰذا جن سے پیشگی قیمت وصول ہے، انھیں بکلیف محصول نہ دی جائے گی مطبع سے ٹکٹ لگا کر کتاب ارسال کی جائے گی، اور جو صاحب اب طلب کریں گے ان سے للعہ (چار روپے) قیمت لیں گے، اور متعدد جلدوں کے خریدار کی رعایت بدستور ملحوظ ہے، ان کا حساب علیحدہ فہرست میں محفوظ ہے۔"

اس اعلان کے بعد بھی تصویر تیار نہ ہو پانے کی وجہ سے کلیات کا "شائقین میں تقسیم ہونا چند دنوں تک ملتوی رہا۔ تین ہفتے کے بعد ۹ر جون کے اخبار کے ذریعے یہ اطلاع دی گئی کہ :-

"بوجہ عدم طیاری تصویر جناب مرزا صاحب موصوف کلیات بخدمت شائقان تقسیم ہونا ملتوی تھا۔ اب طیاری ہو گئی اور عنوان کتاب میں بموقع مناسب لگائی گئی۔ اس ہفتے سے بخدمتِ شائقان ارسال ہے اب اس متاعِ گراں بہا کو بایں ارزانی کہ متاعِ نایاب دکان یہی ہے،

ہاتھوں ہاتھ لیں، فرصت غنیمت جانیں۔[10]

تھوڑے سے لفظی رد و بدل کے ساتھ اسی قسم کا اشتہار بعد کے بعض شماروں میں بھی شائع ہوا۔ ان اشتہاروں کی روشنی میں یہ بات قطعی طور پر طے ہو جاتی ہے کہ تقریباً ڈیڑھ برس کے انتظار کے بعد جون ۱۸۶۳ء کے اوائل میں "کلیات غالب" کی یہ اشاعت ہر اعتبار سے مکمل ہو کر بازار میں آچکی تھی لیکن مرزا غالب تک اس کے پہنچنے میں مزید کچھ دن لگ گئے، علائی کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی چند جلدیں غالباً نواب ضیاء الدین احمد خاں کے مملوکہ قلمی نسخے کے ساتھ پہلے لوہارو پہنچیں اور ان میں سے کچھ مجلد وہاں سے دہلی آئے، غالب کو یہ جلدیں ۲۰ ستمبر ۱۸۶۳ء کو جو اس خط کی تاریخ تحریر ہے یا اس سے ایک دو روز قبل موصول ہوئی تھیں۔ غالب نے ان کی دستیابی کی رسید کے طور پر اس خط میں لکھا تھا کہ

> پہلے خط اور پھر بتوسط برخوردار علی حسین خاں مجلد کلیات فارسی پہنچے، حیرت ہے کہ چار روپے قیمت کتاب اور چار آنے محصول ڈاک "غالب المطابع" میں اگر پانچ روپے قیمت اور پانچ آنے محصول قرار پاوے خیر جہاں سو وہاں سوا سو۔ میرا حال تم کو اور تمہارا حال مجھے معلوم ہے
>
> ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر۔
>
> اب کے چھٹے میں شاید نہ دے سکوں۔ نومبر سنہ حال میں پچاس تمھارے پاس پہنچ جائیں گے۔

یہ خط لکھتے وقت غالباً یہ بات غالب کے ذہن سے محو ہو چکی تھی کہ پہلے اشتہار کے مطابق چھاپا تمام ہونے کے بعد طلب کرنے والوں کے لیے قیمت خرید پانچ روپے ہی مقرر کی گئی تھی، چونکہ ابتدائی ساٹھ صفحات پہلے ہی چھپ چکے تھے، اس لیے سر ورق پر بھی اعلان شدہ قیمت درج کی گئی ہوگی "رفاہ عام" کی غرض سے اسے گھٹا کر چار روپے کرنے کا اعلان ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء کے اشتہار میں کیا گیا تھا جو طباعت مکمل ہو جانے کے بعد جاری ہوا تھا۔

کلیات کی طباعت میں غیر معمولی تاخیر نے اگرچہ غالب کو منشی نول کشور کی طرف سے کسی قدر بددل کر دیا تھا، لیکن علائی کے نام کے خط کے علاوہ دوسرے خطوط میں انھوں نے اس سلسلے میں اپنے جذبات کو پوری طرح قابو میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ منشی جی کو ناراض کرنا خلافِ مصلحت تصوّر کرتے تھے اس عرصے میں دونوں کے درمیان غالباً براہِ راست مراسلت بہت کم ہوئی البتہ بالواسطہ نامہ و پیام کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ قدر بلگرامی کے نام کے خطوط اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ خود قدر بلگرامی کی مطبع نول کشور سے وابستگی بھی غالب ہی کی سعی و سفارش کا نتیجہ تھی۔ ۱۸۶۲ء کے اوائل میں کسی وقت جب کہ وہ بے روزگار اور تلاشِ معاش میں سرگرداں تھے، غالب نے انھیں لکھا تھا:

> تم بہت دن سے بے کار ہو، ایک جگہ مساعدتِ روزگار کی صورت ہے تم بے تکلف میرا یہ رقعۂ مہری لے کر لکھنؤ چلے جاؤ۔ مطبع اودھ اخبار میں میرے شفیق دلی یعنی منشی نول کشور صاحب سے ملو اور یہ رقعہ ان کو پڑھوا دو۔ اپنی نظم و نثر ان کو دکھاؤ، اور اپنا مبلغ علم ان پر ظاہر کرو۔ اگر وہ اپنی مرضی کے موافق تم کو کارگزار سمجھیں گے تو مطبع کا کام تمھارے سپرد کر دیں گے، مشاہرہ خاطر خواہ، تم کو مقرر ہو جائے گا۔ معزز و مکرّم رہو گے، زندگی کا لطف اٹھاؤ گے۔

غالب نے اس خط میں جس اعتماد اور بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ موثر ثابت ہوئی اور قدر مطبع میں ملازم رکھ لیے گئے، لیکن مشاہرہ غالباً ان کی توقع سے کم مقرر ہوا تھا اس لیے انھوں نے غالب کو لکھا کہ وہ منشی صاحب کو لکھ کر اس میں کچھ اضافہ کرا دیں تاکہ وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے ساتھ گھر والوں کی بھی کسی قدر کفالت کر سکیں، غالب نے اس کے جواب میں انھیں صبر سے کام لینے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا:۔

> چند روز صبر کرو، اگر وطن میں ہوتے تو اس بیکاری میں گھر کی خبر کیا لیتے! جس طرح جب گزرتی، اب بھی گزر جائے گی، بلکہ تمھارا

خرچ کم ہو گیا۔ بہر حال ابھی اضافے کے واسطے نہ تم کچھ نہ میں لکھوں۔ دو چار مہینے کام کرو، اس اثنا میں اگر بلگرام میں چھاپے خانہ جاری ہو گیا تو استعفا دے کر چلے جائیو۔ یہاں بعد چند روز کے اضافہ ہونا بھی حیزِ امکان سے باہر نہیں۔

قدر کے توسط سے نامہ و پیغام کے علاوہ غالب اس زمانے میں خاص خاص مواقع پر منشی نول کشور کو براہ راست بھی خط لکھتے رہے۔ چنانچہ قدر کے نام کے ایک خط ہی سے جو ہمارے اندازے کے مطابق چہار شنبہ ۱۱ر جون ۱۸۶۳ء کو لکھا گیا تھا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اسی دن منشی نول کشور کو بھی کسی سلسلے میں مبارک باد کا خط لکھا تھا۔ اس خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اس وقت آپ کی وحشت انگیز تحریر پہنچی۔ ادھر اس کو پڑھا اور ادھر یہ خط بھیجا اور ایک مرزا عباس کو اور ایک خط تہنیت کا منشی صاحب کو لکھا تھا لیکن چونکہ بلا و شرقیہ کو ڈاک نو دس بجے روانہ ہوتی ہے، ناچار تینوں خط بند کر کے تمہارا اور مرزا عباس کا خط بیرنگ اور منشی جی کا پیڈ رکھ چھوڑتا ہوں۔ کل صبح کو بعد از طلوع آفتاب ڈاک میں بھجوا دوں گا۔"

غالب کو ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملا کرتا تھا۔ غدر کے بعد "باغیوں سے اخلاص" کے جرم میں جو خود غالب کے الفاظ میں "مظنّہ محض" تھا، انھیں پنشن کے علاوہ اس اعزاز سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔ پنشن تو کچھ دنوں بعد جاری ہو گئی، لیکن "لاٹ صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی اور مقرری تھا" عرصے تک "مسدود" رہا۔ غالب اس کی بحالی کے لیے سرگرمی کے ساتھ کوشاں تھے۔ فروری ۱۸۶۳ء کے اواخر میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب دلّی آئے اور انھوں نے وہاں دربار کیا "ناگاہ دربار کے تیسرے دن غالب کی طلبی ہوئی اور جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو "جو بات تصور میں تو کیا، تمنا میں بھی نہ تھی" وہ حاصل ہوئی لفٹنٹ گورنر نے وقت رخصت خلعت سے سرفراز کیا اور یہ مژدہ بھی سنایا گیا کہ

گورنر جنرل بہادر کے ہاں بھی دربار اور خلعت کھل گیا، اب نالے جاؤ گے تو پاؤ گے"۔ یہ غیر متوقع اور خلافِ امید خوشی ایسی نہ تھی کہ جس میں غالب اپنے احباب کو شریک نہ کرتے۔

چنانچہ باوجود اس کے کہ سیدھے ہاتھ میں پھوڑے کی غیر معمولی تکلیف کی وجہ سے وہ اب نالے نہ جا سکے، انھوں نے اپنے متعدد دوستوں اور شاگردوں کو خطوط لکھ کر "یاوریِ اقبال" کی اس کارفرمائی سے مطلع کیا۔ منشی نول کشور ان کے مکرم و شفیق دوست ہونے کے علاوہ ایک کثیر الاشاعت اخبار کے مالک بھی تھے، جس کے ذریعے وہ اس نوید مسرت کو زیادہ آسانی سے عام کر سکتے تھے اور گورنمنٹ کی اس عنایت و نوازش کے تشکر میں ان کے جذبات ممنونیت کو بالواسطہ حکام اعلیٰ تک پہنچانے میں بھی مددگار ہو سکتے تھے۔ چنانچہ غالب نے انھیں جو خط لکھا اس میں ان تمام نزاکتوں اور مصلحتوں کو ملحوظ رکھا تھا۔ منشی جی نے ان کی خواہشِ پنہاں کے عین مطابق یہ خط ۲۵ مارچ ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار میں شائع کر دیا جہاں سے اسے "اردوئے معلّی" مرتبہ جناب فاضل لکھنوی کے حوالے سے سطور ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔

منشی صاحب جمیل المناقب جناب منشی نول کشور صاحب کو

دولت و اقبال و جاہ جلال روز افزوں نصیب ہو۔

چونکہ احباب کامیابی و شادکامی احباب سے شاد ہوتے ہیں اس واسطے مجھے ان دنوں میں یاوریِ اقبال سے ایک امر خوشی کا پیش آیا ہے تو آپ کی خوشی کے واسطے لکھتا ہوں۔ بلکہ نظر ہمدگر کے اتحاد پر تم کو تہنیت دیتا ہوں۔

آپ کو مبارک ہو کہ اواخر ماہ گزشتہ کو جو حضرت فلک رفعت نواب معلی الالقاب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب دہلی میں تشریف لائے تو سہ شنبہ کے دن ۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو اس گمنام گوشہ نشین کو یاد فرمایا اور از راہ بندہ پروری کمال عنایت سے خلعت عطا کیا۔

سبحان اللہ! جو لوگ متعلق ہیں لفٹنٹ گورنر پنجاب سے وہ قسمتِ ہل

کے کتنے اچھے ہیں۔ جناب نواب معلی الالقاب کے مکارم اخلاق وہ روح افزا کہ جس سے مردہ زندہ ہو جائے۔ صاحبِ والا مناقب ٹامس ڈگلس فورسائڈ صاحب بہادر سکرتر کے کلماتِ شفقت آمیز وہ روح آسا کہ سن کر بیمار شفا پائے۔ میں رنجور و ناتواں گیا تھا، شادماں آیا۔ بلکہ بوڑھا گیا تھا، جوان آیا۔ سچ ہے۔

وزیرے چنیں شہر یارے چناں

جہاں چوں نہ گیرد قرارے چناں

...... لفٹنٹ گورنر بہادر اور صاحب سکرتر بہادر کا کیا کہنا آفتاب و ماہتاب ہیں مگر پنڈت من پھول سنگھ صاحب میر منشی بھی دیانت و امانت و کار پردازی و مظلوم نوازی میں انتخاب ہیں۔ یہ نہ مبالغہ ہے نہ خوشامد ہے، بیان واقعی ہے۔ شاعرانہ سخن سازی کو میں نے دخل نہیں دیا ہے۔ وہ لکھا ہے جو سچ اور واجبی ہے فقط۔

دوامِ دولتِ سرکارِ انگریزی کا طالب

رنجورِ ناتواں، اسداللہ خاں غالب[15]

یہ خط اودھ اخبار میں منشی نول کشور کے ایک تمہیدی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا جو درج ذیل ہے:۔

بخت مند ہر زمانے میں کامیاب ہوتے ہیں، اہل جوہر تعظیم و توقیر کو انتخاب ہوتے ہیں۔ دیکھیے ان دنوں میں سرکار نے کیسی مہربانی کی، کمال قدر دانی کی، نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مرزا اسداللہ خاں غالب کو خلعتِ فاخرہ عطا فرمایا اور رئیس نوازی کی نظر سے بہ دل التفات کر کے ہم چشموں کو ان کا اعزاز و اکرام دکھایا۔ زیادہ کیا احتیاج بیاں ہے، ان کے خط سے یہ حال عیاں ہے[16]

طرفین کی جانب سے اس غائبانہ مظاہرۂ اخلاص و اتحاد سے بخوبی ظاہر

ہے کہ دونوں کے درمیان جو سلسلہ روابط جولائی ۱۸۶۰ء میں باہم تبادلۂ خطوط کے ساتھ قائم ہوا تھا، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کافی مربوط و مستحکم ہو چکا تھا، لیکن "ردیش ندیدہ و دل بمہرش گرویدہ" والی کیفیت ہنوز برقرار تھی۔ حسن اتفاق سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد دسمبر ۱۸۶۳ء کے اوائل میں منشی نول کشور کا بسلسلۂ کاروبار دہلی جانا ہوا اور وہ وہاں ہفتے عشرے کے قریب مقیم رہے۔ اس عرصے میں ان کے اور غالب کے درمیان کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ غالب کے بعض خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے مل کر ان کے حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ منشی جی کو ابھی دہلی میں وارد ہوئے ایک دو روز ہی ہوئے تھے کہ غالب نے ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ مطابق ۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کو نواب علاء الدین احمد خاں کو ان سے اپنی ملاقات کی کیفیت اور ان کے متعلق اپنے تاثرات سے ان الفاظ میں آگاہ کیا:

> شفیقِ مکرم و لطفِ مجسم منشی نول کشور صاحب بسبیل ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمہارے چچا اور تمہارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے گویا بجائے خود قران السعدین ہیں۔

غالب نے اس وقت تک کلیات فارسی کے دس مجلد جن کی خریداری کا انھوں نے وعدہ کر رکھا تھا، نہیں منگائے تھے۔ علائی کے نام ۲۰ ستمبر کے خط میں انھوں نے اگرچہ اس کی قیمت میں اضافہ پر حیرت کا اظہار کیا تھا، تاہم بدرجہ مجبوری پچاس روپے میں دس جلدیں خریدنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ جب منشی نول کشور سے اس سلسلے میں گفتگو ہوئی تو وہ نہ صرف یہ کہ تخفیف شدہ قیمت یعنی چار روپے چار آنے فی جلد مع محصول ڈاک بلکہ پہلے اشتہار میں درج پیشگی قیمت یعنی تین روپے چار آنے فی جلد کے حساب سے مطلوبہ جلدیں فراہم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ غالب نے اس تازہ خط میں ان کی اس عنایت خاص کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

> تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت

پچاس روپے مان لیے تھے۔ اب ان سے جو ذکر آیا تو انھوں نے پہلی قیمت
مشتہرۂ اخبار یعنی قبولی کی یعنی تین روپے چار آنے فی جلد۔ اس صورت
میں دس مجلد کے بتیس روپے آٹھ آنے میں اور بتیس روپے آٹھ آنے تم دو
ہگی پینسٹھ روپے مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہئیں۔ میں دسمبر ماہ
حال کی دسویں گیارہویں کو طالب ہوں گا۔

منشی نول کشور ۹ یا ۱۰ دسمبر کو دلّی سے روانہ ہوگئے۔ غالب نے ۱۱ دسمبر کو
علائی کے نام خط میں اس اطلاع کے ساتھ کہ منشی جی کو "بسواری ڈاک روانۂ لکھنؤ
ہوئے آج چوتھا یا پانچواں دن ہے" ان سے اپنی ایک ملاقات اور اس کے ایک خاص موضوع
گفتگو کا بھی ذکر کیا ہے۔ شاعرانہ سخن سازی وقتاً فوقتاً اعلانِ بریت کے باوجود غالب
کا محبوب مشغلہ رہی ہے۔ اس خط میں مذکور واقعہ اس کی بہترین مثال ہے اور منشی نولکشور
کے حضور ان کے اظہارِ نیازمندی کی مکمل تصویر کشی کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ایک روز منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور برخوردار
> شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کرکے کہا: اگر میں
> دنیادار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا؟ مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا
> ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار یعنی
> سات سو پچاس روپے سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں، بارہ سو
> روپے رام پور سے، چوبیس روپے سال ان مہاراج سے۔ توضیح یہ ہے
> کہ دو برس سے ہر مہینے میں چار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں، قیمت نہیں لیتے
> مگر ہاں اڑتالیس ٹکٹ مطبع بھیج دیا کرتا ہوں۔

خود منشی نول کشور کے لیے بھی غالب کی خدمت میں حاضری کا شرف "ملاقاتِ
مسیحا و خضر" کی سعادت سے کم نہ تھا۔ وہ اسے اپنی بڑی خوش قسمتی تصور کرتے تھے کہ
دہلی کے اس سفر کے دوران انھیں ایک ایسے شخص کی صحبتوں میں باریابی کے مواقع حاصل
ہوئے جو ہر اعتبار سے یگانۂ عصر اور منتخب روزگار تھا۔ چنانچہ جب وہ لکھنؤ واپس

پہنچے تو ۲۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کے اخبار میں اپنی روداد سفر کے تحت انھوں نے اس حسن اتفاق کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا:

> جناب فیض مآب، یگانہ سحر پرداز، نکتہ سنج سراپا اعجاز، رنگ افزائے نازک خیالی، ہنگامہ آرائے بلند خیالی، دقیقہ یاب فکر و نظر، آموزگار اہل ہنر، فرازندۂ لوائے سحبانی، نوازندۂ کوس خوش بیانی [؟]، ناشر نغمات یکتائی در مشارق و مغارب، جناب مرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب کی ملازمت سے مشرف ہوا۔ شرف ملازمت کا حصول اتفاقات نادرہ سے سمجھا۔ عنایت ایزدی کا شکریہ ہے کہ ایسے وحید عصر، یگانہ آفاق، سرآمد فضلائے روزگار، آفتاب اقلیم فضل و کمال سے ملازمت حاصل ہوئی۔[۲۹]

۲۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار میں اپنی روداد سفر کی اشاعت کے بعد اگلے شمارے میں منشی نول کشور نے غالب کا ایک فارسی قصیدہ "در مدح نواب لارڈ الگن صاحب بہادر مرحوم" اپنے ایک نوٹ کے ساتھ شائع کیا[۳۰] لارڈ الگن جنوری ۱۸۶۲ء میں پنجاب کی گورنری سے ترقی پا کر "وائسرائے قلمرو ہند" مقرر ہوئے تھے اور غالب کا دربار اور خلعت لارڈ کیننگ کے حکم کو منسوخ کر کے انھوں نے بحال کیا تھا۔ یہ قصیدہ ۱۶ مارچ سے ۲۷ مارچ ۱۸۶۳ء کے درمیان ان کی خدمت میں ارسال کیا گیا تھا اور غالب کو اس کی رسید مورخہ [؟] ۳۰ جولائی ۱۸۶۳ء "خاطر آشوبی" کے ایک طویل اور صبر آزما مرحلے سے گزرنے کے بعد ۳ اگست ۱۸۶۳ء کو موصول ہوئی تھی۔ منشی نول کشور غالباً دھواری [؟] میں تھے کہ گورنر جنرل موصوف کا انتقال ہو گیا۔[۳۱] چونکہ متوفی وائسرائے کے حضور میں پیش کردہ اس نذرانۂ عقیدت کی تجدید اور اس دعا گوئی اور خیر خواہی کے صلے میں بصورت رسید چیف سکریٹری کے مراسلہ "خریطۂ خوشنودی" کی اشاعت کے ذریعے عزت و توقیر بہ نگاہ سرکار کے اشتہار کا یہ بہترین موقع تھا۔ اس کے علاوہ یہ قصیدہ کلیات مطبوعہ میں بھی جگہ نہ پا سکا تھا[۳۲] اس لیے ممکن ہے کہ غالب نے منشی نول کشور

سے کسی ملاقات کے دوران انھیں اودھ اخبار میں شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی ہو یا خود منشی نول کشور ہی نے اس کی اشاعت پر زور دیا ہو، بہر صورت گمانِ غالب یہ ہے کہ منشی جی اس قصیدے اور خط کی نقلیں اپنے ساتھ ہی دہلی سے لکھنؤ لائے تھے۔ ۳۰ دسمبر ۱۸۶۳ء کے اخبار میں انھوں نے نقل سرنامہ، نقلِ خط اور اشعار قصیدہ سے قبل " نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب " کے زیرِ عنوان یہ نوٹ تحریر کیا تھا۔

مرزا صاحب اقلیم بلند نامی کے بادشاہ ہیں۔ سب خاص و عام ان کے نامِ گرامی سے آگاہ ہیں۔ ان کی تعریف زبانِ قلم پر لانا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے، ان کے صفاتِ حمیدہ اور کمالات پسندیدہ سے واقف تمام زمانہ ہے۔ شعرائے ہند کو ان کے نام سے اعتبار ہے فصحائے فارس کو ان کی تعریف میں دخل ہے (کذا) بار بار لکھنا تحصیل لاحاصل ہے۔ مرزا نے ایک قصیدہ لارڈ ایلجن صاحب بہادر گورنر جنرل کشور ہند کی مدح میں بھیجا تو اس کے جواب میں سکرٹرا عظم کا دستخطی خریطہ آیا، اس خط اور قصیدے کے دیکھنے سے پروپرائٹر مطبع کو نہایت سرور ہوا۔ کلیات غالب میں یہ قصیدہ نہ تھا، اب اس کا چھاپنا ضرور ہوا، لہٰذا مع نقلِ خط نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند ذیل میں تحریر ہے ناظرین باتمکین ملاحظہ فرمائیں کہ ہر شعر بے نظیر ہے۔ خط سے قدردانی سرکار ظاہر ہے عزت و توقیر مرزائے نامدار ظاہر ہے۔

دہلی سے منشی نول کشور مرزا غالب کی پر لطف صحبتوں کی یاد اور اس قصیدے اور خط کی نقلوں کے علاوہ ایک اور تحفۂ نایاب بھی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے یہ تحفہ تھا غالب کا کلیاتِ نثر فارسی جو ان کی تین کتابوں "پنج آہنگ" "مہر نیم روز" اور "دستنبو" کا مجموعہ تھا اور جسے نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کلیات نظم کی طرح بڑی محنت اور احتیاط سے مرتب کیا تھا۔ یہ تینوں کتابیں اس سے قبل زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی تھیں۔ "پنج آہنگ" پہلی بار بہ تصحیح حکیم غلام نجف خاں

مطبع سلطانی، لال قلعہ دہلی سے ۳ رمضان ۱۲۶۵ھ مطابق ۲۳ اگست ۱۸۴۹ء کو اور دوسری مرتبہ تصحیح مصنف مطبع دارالسلام دہلی سے اپریل ۱۸۵۳ء (رجب یا شعبان ۱۲۶۹ھ) میں شائع ہوئی تھی۔ "مہر نیمروز" کا پہلا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں مطبع فخر المطابع دہلی نے شائع کیا تھا اور "دستنبو" بار اول مرزا صاحب کی خاص ہدایات کے تحت ان کے شاگرد رشید منشی شیو نرائن آرام نے نومبر ۱۸۵۸ء (ربیع الآخر ۱۲۷۵ھ) میں اپنے مطبع مفید خلائق، آگرہ میں چھاپی تھی۔ پہلی دونوں کتابوں کی کتابت و طباعت سے غالب حد درجہ نامطمئن اور بد دل تھے۔ صفیر بلگرامی کے نام ایک خط میں دیوان اردو اور ان دونوں تصانیف میں کاتبوں کی دراندازی کا ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> خدا کی مار کاتبان ناہنجار پر، میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیمروز (کا) ستیاناس کر کے چھوڑ دیا۔

کتابت کے اس نقص سے قطع نظر پنج آہنگ کا مطبوعہ نسخہ صرف ان تحریروں اور خطوط پر مشتمل تھا جو ۱۸۵۳ء تک لکھے گئے تھے یا اس وقت تک یکجا کیے جا سکے تھے دس سال کے عرصے میں ان کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا اور یہ تمام تحریریں ضیاء الدین احمد خاں کے مرتبہ اس کلیات میں شامل تھیں۔ اس نسخے کی کیفیت اور منشی نول کشور کے ساتھ اس کے لکھنؤ پہنچنے کی روداد خود مرزا غالب نے "خاتمۂ پنج آہنگ" میں اس طرح بیان کی ہے۔

> ..... درین روزگار کہ سنین ہلالی ہجریہ سہ ہزار و دو صد و ہشتاد شمار آمد، روشن دل فروغانی گہر مہر هزار آزرم گستر، منشی نول کشور نام آمد را بدین ویرانۂ شاہجہاں آباد نام گزار افتاد۔۔
>
> ازانجا کہ درویش نوازی خوے اوست، بہ کلبۂ احزانِ من رہسے آمد بشادمانی دیدارش خود را چشم روشنی گفتم، خجستہ شرہاے بنشستن کہ این صحیفۂ ازآنہاست از والا برادر والا فر نواب خجستہ القاب ضیاء الدین

خان بہادر ..... بہ سبنج گرفت و با خود بہ لکھنؤ برد تا ایں کلام نا مطبوع را بہ پیرایۂ طبع آراید ..... (طبع چہارم ص ۲۵۲)

کلیات نظم کو زیورِ طبع سے آراستہ دیکھنے کے لیے غالب کو ڈیڑھ، پونے دو برس انتظار کرنا پڑا تھا۔ کلیات نثر کی اشاعت میں اس سے بھی زیادہ وقت صرف ہوا اور اس کا پہلا ایڈیشن، اس کے حصول کے پورے چار سال بعد جنوری ۱۸۶۸ء مطابق رمضان المبارک ۱۲۸۴ھ میں منظر عام پر آیا۔ اس کے باوجود نہ تو غالب کے کسی خط میں اس طویل تر وقفۂ انتظار پر بیتابی یا بددلی کے اظہار کا کوئی سراغ ملتا ہے اور نہ کسی دوسرے ذریعے ہی سے اس کی وجوہات سامنے آتی ہیں۔ یہ ایڈیشن انتیس[۲۹] سطری مسطر کے دو سو بارہ صفحات پر شائع ہوا تھا۔ "خاتمۃ الطبع" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت اور طباعت میں صحت اور نفاست کے اہتمام کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ یہ خاتمہ جو منشی خدا علی عاشق کا لکھا ہوا ہے، رسمی نوعیت کے چند توصیفی کلمات حذف کرکے سطور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

الحمد للہ والمنۃ کہ دریں زمانِ سعید و آوانِ حمید از مترشحاتِ قلمِ اعجاز رقم جناب مستطاب والا خطاب ..... شیر بیشۂ سخنوری، مسیح زبانِ پارسی و دری، افصح الفصحا، ابلغ البلغا امیر کبیر جناب نواب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر عرف مرزا نوشہ متخلص بہ غالب، المشہور المشارق والمغارب۔ چناں کہ در شان خود می فرماید

بیت ؎

لختے زدساتیر بود نامۂ ما ساسانِ ششم لبکار روانی مائیم

لراقمہ ؎

از سرِ انصاف منصف را نشاید در گذشت
حق تعالیٰ رتبۂ انصاف بالا کردہ است

پارسی مردہ راانجشید جانِ تازہ
غالبؔ معجز بیاں کارِ مسیحا کردہ است

کلیاتِ نثر مشکبو اغنی پنج آہنگ و مہر نیم روز دستنبو کہ در سلاست و متانتِ عبارت لاجواب و بے مثال است، در مطبعِ آفاق مرجعِ عالی جناب فیض مآب .... جناب منشی نول کشور صاحب دام اقبالہٗ خوش خط و عمدہ بہ نہایت تصحیح و تنقیح بسعیِ کارگزارانِ مطبعِ موصوف بماہِ جنوری ۱۸۶۸ء مطابق شہر رمضان المبارک ۱۲۸۴ھ لباس انطباع پوشیدہ مرغوب انام و مطبوعِ خواص و عوام گردید۔ فقط

طبع اول میں خاتمے کے بعد "قطعہ تاریخ الراقم" کے زیرِ عنوان خاتمہ نگار منشی ندا علی عیش کا یہ قطعہ شاملِ اشاعت ہے ؎

زہے ایں کلیاتِ نثرِ غالبؔ	کہ شد مسرور ہر طبعے ز طبعش
رقم زد عیش از روئے انصاف	بود مطبوعِ دل ہا نثرِ دلکش ۱۲۸۳ھ

۱۲۸۴ھ = ۱ + ۱۲۸۳

کلیاتِ نظم اور کلیاتِ نثر کی اشاعت کے درمیان غالبؔ کا ایک مختصر رسالہ موسوم بہ "نامۂ غالب" اودھ اخبار کی دو اشاعتوں میں اور حضرت علی سے منسوب "دعاء الصباح" کا منظوم فارسی ترجمہ مطبع نول کشور سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ "نامۂ غالب" "برہان قاطع" کے قضیے کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ غالب نے اس کتاب کے رد میں "قاطع برہان" لکھ کر اور اسے شائع کر کے گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ مارچ ۱۸۶۲ء میں اس کتاب کی اشاعت کے بعد انھیں بقول خود کئی طرف سے "سہامِ ملامت کا ہدف بننا پڑا" اور "معتقدانِ برہان قاطع (ان کے مقابلے کے لیے) برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے"۔ چنانچہ ان کی "اس نگارش کی تردید میں کئی کتابیں" بنائی گئیں" اور چھپوائی گئیں۔ منشی سعادت علی دہلوی کی محرقِ قاطع برہان" (مطبوعہ مطبع احمدی، شاہدرہ دہلی طبع ۱۸۶۳ء) کے بعد

مرزا رحیم بیگ کی "ساطع برہان" اس جوابی سلسلے کی دوسری کتاب تھی۔ یہ کتاب ۱۲۷۹ھ (۶۳-۱۸۶۲ء) میں لکھی گئی اور ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں مطبع ہاشمی میرٹھ میں چھپ کر سامنے آئی۔[۱] غالب اس سے قبل ۱۸۶۴ء میں محرق قاطع برہان کے رد میں منشی میاں داد خاں سیاح کے نام سے "لطائف غیبی" لکھ کر شائع کر چکے تھے۔ چونکہ "ساطع برہان" میں غالب کے اپنے الفاظ میں "بیشتر محرق قاطع کے مضامین منقول" تھے اور زیادہ تر "وہ باتیں تھیں جن کو (وہ) لطائف غیبی میں رد کر چکے تھے" اس لیے انھوں نے اس کے جواب میں "ایک خط مرزا جی کو لکھ بھیجا" زیادہ اس طرف التفات کو تضیع اوقات جانا" لیکن جب اس قضیے نے مزید طول کھینچا تو انھوں نے یہ خط بھی جو اپنی ہیئت ظاہری کے اعتبار سے بھی مکتوبات ہی کے ضمن میں آتا ہے "نامۂ غالب" کے نام سے سولہ صفحات کے ایک رسالے کی شکل میں مطبع محمدی دہلی سے چھپوا کر شائع کر دیا۔ منشی میاں داد خاں سیاح کے نام ۷ر ستمبر ۱۸۶۵ء کو لکھے ہوئے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اس رسالہ کی صرف تین سو جلدیں اپنے صرف زر سے چھپوائی تھیں اور اس خط کی تحریر سے پہلے وہ ان میں سے بیشتر "دور و نزدیک" کے احباب اور قدر شناسوں میں تقسیم کر چکے تھے غالباً محدود تعداد میں چھپنے کی وجہ سے اس رسالے کی وسیع پیمانے پر اشاعت نہ ہو سکی تھی، اس لیے اسے دوبارہ شائع کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ منشی نول کشور نے خود غالب یا ان کے کسی شاگرد کے ایما پر یہ رسالہ اودھ اخبار کے ۱۰ر اکتوبر اور ۱۷ر اکتوبر ۱۸۶۶ء کے دو شماروں میں بالاقساط شائع کر دیا۔[۲] غالب کی کسی تحریر میں اس دوسری اشاعت کا حوالہ موجود نہیں۔

"دعائے ماثور و منقول از جناب امیر علیہ السلام" کا منظوم ترجمہ مطبع نول کشور نے "حسب الایماے مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ" شائع کیا تھا۔ یہ غالب کی واحد معلوم تصنیف ہے جس کا ان کی یا ان کے زمانے کی کسی تحریر میں ذکر نہیں ملتا۔ اس کی متذکرہ اشاعت کا اب تک صرف ایک نسخہ دستیاب ہو سکا جو جناب کالی داس گپتا رضا کی ملکیت ہے۔[۳] اس نسخہ میں کسی جگہ اس کا سالِ طباعت

درج نہیں۔ البتہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ایک قلمی نسخہ جو اسی مطبوعہ نسخے سے
۲۳ رجب ۱۲۸۴ھ (۲۰ نومبر ۱۸۶۷ء) کو نقل کیا گیا ہے اس امر کی تصدیق کرتا ہے
کہ یہ ترجمہ غالب کی زندگی میں اور نومبر ۱۸۶۷ء سے قبل چھپ چکا تھا۔ مرزا عباس
بیگ مرزا غالب کے حقیقی بھانجے تھے اور ۱۸۶۳ء کے بعد کسی وقت ڈپٹی کلکٹری
سے ترقی پاکر لکھنؤ کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے تھے، اس اعتبار سے
اس کی طباعت کا زمانہ ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۷ء کے درمیان محدود کیا جا سکتا ہے۔

جنوری ۱۸۶۴ء سے جنوری ۱۸۶۸ء تک کی چار سالہ مدت میں اور اس کے بعد
غالب کی بقیہ ایک سالہ زندگی میں "نامۂ غالب" اور "دعائے صباح" کے علاوہ ان کی
کسی معروف و معلوم مستقل تصنیف کا مطبع نول کشور سے شائع نہ ہونا بالتحقیق معلوم ہے
لیکن اس عرصے میں ان کا کلام اور ان سے متعلق خبریں یقیناً اودھ اخبار میں کبھی کبھی شائع
ہوتی رہی ہوں گی۔ فی الوقت اس امر کی تصدیق کا کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ اس لیے کہا جا
سکتا ہے کہ دستیاب معلومات کی حد تک غالب کا کلیاتِ نثر ان کی آخری تصنیف ہے، جو
ان کی زندگی میں مطبع نول کشور سے شائع ہو کر "مطبوعِ انام اور مقبولِ خاص و عام" ہوئی۔

غالب نے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو وفات پائی۔ مشاہیر کے انتقال پر تعزیتی
نوٹ، ان سے متعلق نظمیں اور قطعات تاریخ شائع کرنا اودھ اخبار کے معمولات
میں شامل تھا۔ بعض شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسروں کے برخلاف غالب کی
وفات پر ماتم سرائی کا یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا چنانچہ ۱۶ مارچ ۱۸۶۹ء کے
شمارے میں مرزا قربان علی بیگ سالک کا ترجیع بند "غالب مرحوم" کے عنوان سے،
۱۹ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے شمارے میں مرزا ہرگوپال تفتہ کے آٹھ قطعات تاریخ اور
۲۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے پرچے میں انھی کا لکھا ہوا طویل فارسی ترکیب بند شائع ہوا
تفتہ کے قطعاتِ تاریخ کے ساتھ ایک نوٹ بھی شائع ہوا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
یہ قطعے انھوں نے خود "بہ ارشادِ طبع" اخبار کے دفتر میں بھیجے تھے اور "سابق ازیں
اخباراتِ دیگر میں درج" ہو چکنے کے باوجود "بہ پاسِ ارشادِ جناب موصوف بطرزِ

قدِ مکرر اودھ اخبار میں چھاپے" گئے تھے[۵۲] اخبار کے فائلوں کی نایابی کی وجہ سے اس سلسلے کی مزید تفصیلات نامعلوم ہیں۔ اگر اس زمانے کے تمام شمارے دستیاب ہو جائیں تو وفاتِ غالب سے متعلق ایسی متعدد نگارشات کے سامنے آنے کا امکان ہے جن تک ہنوز کسی دوسری ذریعہ سے رسائی نہیں ہو سکی ہے۔

منشی نول کشور نے غالب کی رحلت کے بعد کامل چھبیس[۲۶] سال زندہ رہ کر ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء کو انتقال کیا۔ اس دوران میں انھوں نے "کلیات غالب" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" دونوں کے کئی کئی ایڈیشن شایع کیے اور دوسرے مطبعوں کے شائع کردہ معتبر نسخوں کی بنیاد پر "عودِ ہندی" اور دیوان اردو کے متعدد ایڈیشن چھاپ کر سابقہ مطبوعات کی فہرست میں دو نئی کتابوں کا اضافہ کیا۔ ان تمام اشاعتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کلیات غالب

"کلیات غالب" کا پہلا نولکشوری ایڈیشن اکیس سطری مسطر کے پانچ سو باسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ کلام غالب رباعیات کے ساتھ صفحہ ۵۵۲ پر ختم ہو جاتا ہے۔ آخر کے دس صفحے (۵۵۳ تا ۵۶۲) تقریظوں، تاریخی قطعوں اور خاتمۃ الطبع کے لیے مخصوص ہیں۔ پہلی تقریظ خود مصنف کی ہے اس کے بعد میر مہدی مجروح، مرزا اصغر علی خاں نسیم، محمد عبد الغنی ہنی، منشی امیر اللہ تسلیم، منشی اشرف علی اشرف اور مردان علی خاں رعنا کے منظومات و قطعاتِ تاریخ کو جگہ دی گئی ہے مجروح کی طویل نظم کے تاریخی مصرعے سے ۱۲۷۸ھ اور منشی اشرف علی اشرف کے دو قطعات میں سے دوسرے قطعے سے ۱۸۶۳ء برآمد ہوتا ہے۔ باقی تمام تاریخیں ۱۲۷۹ھ پر مشتمل ہیں۔ آخر میں (ص ۵۶۱، ۵۶۲) مولوی ہادی علی اشک کا لکھا ہوا خاتمۃ الطبع ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس نسخے کی تصحیح پر غیر معمولی توجہ صرف کی تھی حتیٰ کہ شبہات کی صورت میں خود مصنف سے صلاح و مشورہ کے بعد صحیح متون کا تعین کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے اصل الفاظ حسب ذیل ہیں۔

ہادیِ خشک سر بے دستگاہ ...... تا مقدور در مقابلہ و تصحیح کوتہی فکر د و قدر میسور از دل نہادن پہلو تہی فکر د مصنف

صواب اندیشی را دریں تہذیب باخویشتن انباز نمود۔ آنچہ ندانست، بزبان خامہ و سفارت نامہ در خدمتش باز نمود، اشارتے کہ رفت برطبق آں کار بست و پنجۂ سلمائے تحقیق رانگار بست۔ (ص ۵۶۱، ۵۶۲)۔

یہ "خاتمۃ الطبع" بھی ایک قطعۂ تاریخ پر ختم ہوتا ہے جس کے چوتھے شعر کے مصرع ثانی "جلا گرفت ز نو طبع گوہر معنی" سے ۱۲۷۹ھ حاصل ہوتا ہے۔ اس ایڈیشن کے خاتمۃ الطبع یا کسی اور اندراج سے یہ پتا نہیں چلتا کہ اس کی طباعت کا کام کس زمانے میں مکمل ہوا۔ البتہ یہ بات کہ یہ پہلا نول کشوری ایڈیشن ہے، سرورق کے اندراج "در مطبع خاص منشی نول کشور دانش آئیں رونق افزائے بزم طبع نخستین شد" اور اشک کے بیان "در مطبع فیض منبع ..... منشی نول کشور ..... بطراز طبع نخستیں رسید" سے معلوم ہو جاتی ہے۔

مطبع نول کشور سے اس کلیات کا دوسرا ایڈیشن جنوری ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے صفحات کی مجموعی تعداد (۵۵۶) ہے۔ اصل کتاب تقریظ مصنف کے ساتھ صفحہ (۵۵۵) کے نصف اول پر ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد منشی محمد حسین متخلص بہ انقلاب رئیس موہان کا لکھا ہوا "خاتمۃ الطبع" ہے اور یہی اس اشاعت کی آخری تحریر ہے۔ پہلی اشاعت میں شامل منظوم تقریظات اور قطعاتِ تاریخ اس ایڈیشن سے خارج کر دیے گئے ہیں۔ خاتمے کی عبارت بہ اختصار سطور ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

"دانا داند و شناسا شناسد کہ غالب را چہ مایہ در قافیہ سنجی دستگاہے بود، و چہ قدر در انشا پردازی پایگاہے، نظمش کہ دیدہ کہ پسند نہ کردہ و نثرش کہ شنیدہ کہ پذیرا نہ نمودہ ..... بہ نام توانائی بخشیِ ایزدِ بخشائشگر کہ در سخن طرازی یگانہ بود و در عبارت آرائی مشہور زمانہ ..... کلیات نظم مرزا صاحب ممدوح الیہ کتابیست کہ نظیرش در عالم مثال معدوم و مثالش در عالم شہود ناپیدا۔ پیش ترازیں بہ مطبعِ

موصوف بہ طبع آمدہ خریداراں سرمایۂ بیش بہا نہ اندوختہ بدست بردند کنوں باز گرد آمدند و از کار فرمائے مطبع درخواستند کہ بار دگر ایں عروس زیور انطباع پوشد۔ ازیں سلسلہ جنبانی بہ ماہ جنوری ۱۸۶۳ء در مطبع اودھ اخبار واقع شہر لکھنؤ بہ اہتمام کارگزاران عہدہ سرمۂ انطباع در چشم کشید (ص ۵۵۵، ۵۵۶)

منشی نول کشور کی زندگی میں ان کے مطبع سے اس کلیات کے مزید دو ایڈیشن ۱۸۸۲ء اور ۱۸۹۳ء میں چھپ کر شائع ہوئے۔ ۱۸۸۲ء کے ایڈیشن کا کوئی نسخہ ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا، اس لیے اس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ ۱۸۹۳ء کا ایڈیشن اشاعت اول کی طرح (۵۶۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق کی آخری سطر اور "خاتمۃ الطبع حال از طرفِ کارپردازانِ مطبع" کے علاوہ اس کے تمام اندراجات بعینہ طبع اول کے مطابق ہیں۔ سرورق کی آخری سطر میں اسے "طبع دوم" قرار دیا گیا ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کلیات کا دوسرا نول کشوری ایڈیشن ہے۔ طبع اول کے لیے مولوی ہادی علی اشک کے لکھے ہوئے "خاتمۃ الطبع" کے بعد "کارپردازانِ مطبع" کی طرف سے جس نئے خاتمے کا اضافہ کیا گیا ہے، وہ بھی اس کے "بار دوم" انطباع پر ہی دلالت کرتا ہے۔ خاتمے کی یہ عبارت درج ذیل ہے۔

"صیرفیانِ سخن را مژدہ باد و جوہریانِ ایں فن را نوید دل شاد کہ بہ لمعاتِ انظارِ توفیق یزدانی و بہ تجلیاتِ انوارِ تائید ربانی آفتاب عالم تاب از افق اقبال طالع شدہ و ماہِ شب افروز از برجِ اجلال ساطع یعنی دریں ایام مسرت انجام منشورِ فصاحت ظہور و طغرائے بلاغت معمور کا نجم ثاقب موسوم بہ کلیات غالب تصنیف منیف و ترصیف رصیف نخل بندِ گلشن تر زبانی، گل بوتۂ گل زمینِ رنگین بیانی عالی مناقب نواب مرزا اسد اللہ خان غالب بہ احسن انتظام و تصحیح مالا کلام در مطبع نامی منشی نول کشور صاحب سی آئی۔ ای واقع لکھنؤ بہ ماہ جون

۱۸۹۳ء بار دوم از حلیۂ طبع آراستہ   ہر صفت قرارہ بر منصۂ شہود جلوہ گر گشت۔

قطعہ تاریخ طبع نتیجۂ فکر گہر بار مولوی سید تصدق حسین صاحب متخلص بہ عاشق مصحح، ملازم قدیم مطبع

مجموعۂ نوادر، دیباچۂ معانی
با صد ہزار تزئیں مطبوع حال گشتہ
عاشق چو منہمک شد در فکر یک زمانے
"بحر محیط غالب" تاریخ سال گشتہ (ص ۵۶۲)

۱۳۱۰ھ

کارپردازان مطبع کی ان صراحتوں کے برخلاف ہماری تحقیق کے مطابق یہ مطبع نول کشور سے شائع شدہ چوتھا ایڈیشن ہے۔ ممکن ہے کہ ۱۸۶۳ء اور ۱۸۹۳ء کے درمیان اس مطبع نے متذکرہ بالا ایڈیشنوں کے علاوہ "کلیات غالب" کا کوئی اور ایڈیشن بھی شائع کیا ہو لیکن فی الوقت ہماری معلومات انھی چار ایڈیشنوں تک محدود ہیں۔

منشی نول کشور کی زندگی میں مطبع نول کشور سے "کلیات نثر غالب" کے کل پانچ ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس سلسلے کے اولین ایڈیشن (طبع جنوری ۱۸۶۸ء) سے متعلق تمام ضروری تفصیلات گذشتہ اوراق میں پیش کی جا چکی ہیں۔ دوسری اشاعت جنوری ۱۸۷۱ء مطابق شوال ۱۲۸۷ھ میں منظر عام پر آئی یہ چار سو اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اصل متن "قطعہ در بیان روشنی دہلی" کے ساتھ صفحہ (۴۱۳) پر ختم ہو جاتا ہے۔ اگلے تین صفحات (ص ۴۱۴ تا ص ۴۱۶) فرہنگ کے لیے مخصوص ہیں۔ آخر کے دو صفحات میں سے صفحہ (۴۱۷) پر "خاتمۃ الطبع" اور صفحہ ۴۱۸ پر منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی منشی اشرف علی اشرف اور احمد حسن خاں جوش کے قطعات تاریخ جو بطور خاص اسی ایڈیشن کے لیے کہے گئے تھے، درج ہیں۔ یہ ایڈیشن داخلی طور پر پہلے ایڈیشن سے صرف اسی حد تک مختلف ہے کہ اس کے حصۂ اول (پنج آہنگ) میں نواب میر غلام بابا خاں

اور منشی نول کشور کے نام کے دو خطوں کا اضافہ کیا گیا ہے اور چونکہ یہ غالب کی وفات کے بعد شائع ہوا ہے، اس لیے "خاتمۃ الطبع" میں ان کے نام کے ساتھ "المشہور فی المشارق والمغارب" کے مابعد "مغفور و مبرور" کے الفاظ شامل کر دیے گئے ہیں۔ مزید یہ کہ زمانۂ طباعت سے متعلق طبع اول کے اندراج "بماہ جنوری ۱۸۶۸ء مطابق شہر رمضان المبارک ۱۲۸۴ھ کو شروع میں لفظ" دوبارہ" کے اضافے کے ساتھ "بماہ جنوری ۱۸۷۱ء مطابق شہر شوال ۱۲۸۷ھ" سے بدل دیا گیا ہے۔

اس ایڈیشن میں ایک اور قابلِ ذکر تبدیلی یہ واقع ہوئی ہے کہ فدا علی عیش کا لکھا ہوا قطعۂ تاریخ جو طبع اول میں "خاتمۃ الطبع" کے آخر میں درج تھا، حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ "پارسی مردہ" پر "غالب معجز بیان" کے احسانات سے متعلق ان دو اشعار کی ملکیت کے تعین، کا کوئی قرینہ باقی نہیں رہا ہے جو "لراقمہ" کے زیرِ عنوان طبع اول کی طرح اس ایڈیشن کے خاتمے میں بھی شامل ہیں۔

"کلیات نثر غالب" کا اگلا ایڈیشن ستمبر ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا۔ یہ اس مطبع کی کانپور شاخ سے شائع ہونے والا پہلا اور نول کشوری سلسلے کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ ۲۱ سطری مسطر کے (۱۴۶) پر صفحات پر مشتمل اس ایڈیشن کی کاپی دوسرے نول کشوری ایڈیشن سے تیار کی گئی ہے لیکن دوسرے ایڈیشن کے برخلاف اس ایڈیشن میں طبع اول کے لیے فدا علی عیش کا لکھا ہوا خاتمۃ الطبع کافی اختصار اور ضروری ترمیموں کے ساتھ "قطعہ در بیان روشنی دہلی" کے مابعد اور فرہنگ سے قبل صفحہ (۱۴۳) پر ہی درج کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کی ضخامت میں اشاعتِ ثانی کی بہ نسبت مجموعی طور پر دو ۲ صفحات کی کمی ہو گئی ہے کتابت کی چند در چند غلطیاں اس ایڈیشن کا نمایاں ترین نقص ہیں جن کا اندازہ سرسری طور پر خاتمۃ الطبع کی مندرجۂ ذیل عبارت کے خط کشیدہ الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔

الحمد للہ والمنۃ کہ دریں زمانِ سعید و آوانِ حمید از منشیٔ شجاب قلم اعجاز رقم جناب مستطاب مہر نیم روز آسمان بلاغت، ماہِ نیم ماہ برج وضاحت، شیر بیشہ سخنوری، مسیح زبانِ پارسی و دری افصح الفصحا

ابلغ البلغا امیر کبیر جناب نواب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان

بہادر عرف میرزا نوشہ متخلص بہ غالب المشہور فی المشارق والمغارب مغفور

مبرور کلیات نثر مشکبو اعنی پنج آہنگ و مہر نیم روز و دستنبو در مطبع آفاق

مرجع عالی جناب، فیضمآب، ابر مطیر سخاوت، جوہر شمشیر شجاعت،

صاحب خلق و مروت، با نروی ہمت رازور جناب منشی نول کشور دام اقبالہ

واقع کانپور بسعی موفور منصرم با کمال لالہ بشیشر دیال صاحب بماہ ستمبر

۱۸۷۵ شسنہ علیسوی لباس الطباع پوشیدہ مرغوب انام و مطبوع خواص وعوام

گردیدہ فقط" (ص ۱۳ا۴)

دار العلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانے میں "کلیات نثر غالب" کے

اس ایڈیشن کا ایک ایسا نسخہ بھی راقم السطور کی نظر سے گزرا ہے جس کے

صفحہ ۱۳ا۴ کے حاشیے پر "تاریخ طبع از عالی طبع مورخ باوقار لالہ مدن موہن

لال سرشار" کے عنوان کے ساتھ مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے۔

جو جملہ نثر غالب طبع گردید	بوقت فرخ و فرخار تاریخ
پئے سالش رقم زد کلک سرشار	"کلام غالب نثار" تاریخ

۱۸۷۵

یہ قطعہ بہ گمان غالب چند کاپیاں چھپ چکنے کے بعد اس صفحے کے حاشیے پر بڑھایا

گیا ہے۔ بعد کی ان کاپیوں میں بعض الفاظ کے نقائص ظاہری کی بھی تصحیح کر دی گئی ہے

مثلاً "خاتمۃ الطبع" کی مندرجہ بالا عبارت میں "ماہ نیم ماہ" کو "ہی" کے دو نقطوں کا اضافہ کر کے

"ماہ نیم ماہ" اور "افصح" کو دوسرا نقطہ حذف کر کے "افصح" بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح

ابتدا میں "ماہ نیم ماہ" میں پہلے "ماہ" کی "ہ" اور "نقطہ" دری" میں "د" غیر واضح تھی، بعد

کی پیش نظر کاپی میں یہ دونوں حرف بھی پوری طرح واضح کر دیے گئے ہیں۔

نگارشات نثر کے اس مجموعے کا چوتھا ایڈیشن اپریل ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا

جو اپنی تمام داخلی و خارجی خصوصیات کے اعتبار سے طبع دوم کے عین مطابق ہے۔ لکھنؤ

کی اشاعتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے "خاتمۃ الطبع" میں اسے اشاعت سوم قرار دیا گیا

ہے۔ اس امر کے اظہار کے لیے اختتام طباعت کے زمانے سے متعلق طبع دوم کے خاتمے کے اندراجات "سہ بارہ بماہِ اپریل ۱۸۸۴ء مطابق شہر جمادی الاخری ۱۳۰۱ھ ہجری" سے بدل دیے گئے ہیں۔[۲۶]

کلیاتِ نثر کی پانچویں اشاعت اپریل ۱۸۸۸ء میں منظرِ عام پر آئی۔ یہ ایڈیشن کانپور سے شائع ہوا ہے لیکن ستمبر ۱۸۷۵ء کے کانپوری ایڈیشن کی بجائے اپریل ۱۸۸۴ء کے لکھنوی ایڈیشن پر مبنی ہے اور از اول تا آخر اسی کے عین مطابق ہے اس لیے اس میں اس قسم کی غلطیاں نظر نہیں آتیں جن کی طرف سابق الذکر کانپوری ایڈیشن کے تعارف میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ غالباً متذکرہ لکھنوی ایڈیشن سے مراجعت ہی کی بنا پر اسے کلیاتِ نثر کے اس اشاعتی سلسلے میں چوتھا نمبر دیا گیا ہے مقام و زمانۂ طباعت کی مناسبت سے خاتمۃ الطبع سابق میں جو ترمیمیں کی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

...... در مطبعِ آفاق مرجع .... جناب منشی نول کشور صاحب دام اقبالہٗ واقع کانپور .... بار چہارم بماہ اپریل ۱۸۸۸ء مطابق شہر شعبان المعظم ۱۳۰۵ھ ہجری لباس انطباع پوشیدہ .....

۱۸۷۱ء اور ۱۸۸۴ء کے لکھنوی ایڈیشنوں کی طرح اس ایڈیشن کا آخری صفحہ (۴۱۸) بھی قطعات تاریخ کے لیے مخصوص ہے۔

اس صفحے پر اولاً "قطعاتِ تاریخ طبع سابق" کے عنوان سے اشاعتِ ثانی کے لیے تسلیم سہسوانی، منشی اشرف علی اشرف اور نواب احمد حسن خان جوشش کے کہے ہوئے قطعات جو ۱۸۸۴ء کے ایڈیشن میں بھی منقول ہیں، درج کیے گئے ہیں بعد ازاں "تاریخ طبع حال" کے طور پر لالہ نرائن بخش راقم خلفِ منشی گوبند پرشاد فضا کا ایک تازہ قطعہ شامل کیا گیا ہے جس کے مادۂ تاریخی "چھپی نثر غالب عجیب" سے ۱۸۸۸ء برآمد ہوتا ہے۔

دیوان غالب

مرزا غالب کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے اردو دیوان کے دو اہم ایڈیشن مطبع نظامی کانپور اور مطبع مفید خلائق آگرہ سے شائع ہوئے تھے۔ مطبع نظامی کی اشاعت ذی الحجہ ۸، ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء) میں اور مطبع مفید خلائق کا نسخہ ۱۸۶۳ء (۱۲۷۹ھ) میں منظرِ عام پر آیا۔ ان میں سے اول الذکر اشاعت غالباً اس وجہ سے کہ اس کا متن مصنف کے نظرِ ثانی اور تصحیح کردہ نسخے پر مبنی تھا، زیادہ مقبول ہوئی کہ منشی نول کشور نے اسی نسخے کی بنیاد پر نومبر ۱۸۷۳ء میں اپنے مطبع سے "دیوان غالب" کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ یہ ایڈیشن بہ اعتبارِ ظاہر نسخۂ نظامی کے عین مطابق اور اکیس (۲۱) سطری مسطر کے (۱۰۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا مختصر "خاتمۃ الطبع" حسب ذیل ہے۔

> "خدا کا شکر ہے کہ ان دنوں دیوان اردو حضرت غالب دہلوی
> مطبع نول کشور صاحب میں بمقام لکھنؤ ماہ نومبر ۱۸۷۳ء کو چھپ کر طیار ہوا
> اہل سخن کا رفع انتظار ہوا۔"

دوسرے اور تیسرے نول کشوری ایڈیشنوں کے زمانۂ اشاعت کے بارے میں ہمیں باوجود کوشش کے کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی۔ چوتھا ایڈیشن طبع اول کے پونے چار سال بعد اگست ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔ یہ ہر اعتبار سے بعینہٖ پہلے ایڈیشن کے مطابق ہے۔ صرف خاتمۃ الطبع میں "بمقام لکھنؤ" کے بعد کے اندراج کو بدل کر "بار چہارم ماہ اگست ۱۸۷۷ء میں" بنا دیا گیا ہے۔ ۱۸۷۷ء کے بعد کے ایڈیشنوں میں سے کسی ایڈیشن کا ایک ناقص الآخر نسخہ جناب کالی داس گپتا رضا کے کتب خانے میں محفوظ ہے جو قدیم کتابوں کے کسی تاجر کی تیار کردہ فہرست کے مطابق ۱۸۷۹ء کا مطبوعہ ہے۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو یہ "دیوان غالب" کا پانچواں نول کشوری ایڈیشن ہوگا۔ مطبع نول کشور کے یہ تمام ایڈیشن مطبع نظامی کے نسخے پر مبنی تھے اور خریداروں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسی کا اندازہ اسی زمانے میں چھپی ہوئی مطبع کی متعدد دوسری کتابوں کے ساتھ ملحق فہرستِ مطبوعات کے اندراجات سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے چنانچہ

اگست ۱۸۸۰ء میں شائع شدہ ایسی ہی ایک فہرست کتب اس دیوان کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات فراہم کرتی ہے :۔

کئی مرتبہ یہ دیوان مختلف مقامات میں چھپا اور بڑی خواہش سے بکا اور ہنوز خواہش خریداراں اسی طرح ہے ۔ کیوں نہ ہو بڑے عالی پایہ مرزا اسد اللہ خان دہلوی کا کلام ہے جس کا مثل و نظیر ہندوستان میں نہیں ہے ۔ یہ مطبوعہ مطبع نظامی سے نقل کرکے طبع ہوا

محفوظ یادداشتوں کے مطابق ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء، صفر ۱۳۰۱ھ مطابق دسمبر ۱۸۸۳ء اور ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں مطبع نول کشور نے اس دیوان کے مزید تین اڈیشن شایع کیے ۔ ان اڈیشنوں تک براہ راست رسائی ممکن نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان کے بارے میں مزید تفصیلات پیش نہیں کی جا سکتیں بر بنائے قیاس فی الحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۷۳ء سے ۱۸۸۶ء تک تیرہ سال کی مختصر مدت میں مطبع نول کشور سے " دیوان غالب " کے کم از کم آٹھ اڈیشن شائع ہو چکے تھے ۔

جولائی ۱۸۸۷ء میں مطبع نول کشور کی کانپور شاخ سے " دیوانِ غالب " کا اولین اڈیشن شائع ہوا ۔ یہ اڈیشن (۱۰۴) صفحات پر مشتمل ہے اور ترتیب ظاہری کے اعتبار سے متذکرہ بالا پہلے اور چوتھے لکھنوی اڈیشنوں سے مطابقت رکھتا ہے اس کے خاتمۃ الطبع میں بتایا گیا ہے کہ " کتابِ ہٰذا مطبع منشی نول کشور واقع کانپور ماہ جولائی ۱۸۸۷ء مطابق شوال ۱۳۰۴ سنہ ہجری میں پہلی مرتبہ چھپی " (ص ۱۰۳) جو لوگ " دیوان غالب " کی مختلف اشاعتوں کی تفصیل سے ناواقف ہیں، وہ خاتمے کی اس عبارت کی بنیاد پر اسے پہلا نول کشوری اڈیشن قرار دے سکتے ہیں جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ کانپور سے چھپنے والا پہلا اور دستیاب معلومات کی حد تک بہ طور مجموعی اس مطبع سے شائع ہونے والا نواں اڈیشن ہے ۔ لکھنوی اڈیشنوں کے برخلاف اس اڈیشن کے آخری صفحے (۱۰۴) کو منشی بھگوان دیال متخلص بہ عاقل ایجنٹ مطبع کے کہے ہوئے دو قطعاتِ تاریخ سے مزین کیا گیا ہے ۔ یہ دونوں قطعے فارسی میں ہیں

جن کے مادہ ہائے تاریخی "دل ربا ہیں نکلے" اور "نفیس دیوان غالب" سے ۱۳۰۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس ایڈیشن کے بعد منشی نول کشور کی زندگی میں یعنی جولائی ۱۸۸۷ء اور فروری ۱۸۹۵ء کے درمیان کانپور یا لکھنؤ سے اس دیوان کے کسی اور ایڈیشن کے منظر عام پر آنے کا حال نامعلوم ہے۔

عود ہندی خطوط غالب کے اس مجموعے کا پہلا ایڈیشن منشی ممتاز علی خاں نے غالب کی وفات سے صرف چند ماہ پہلے ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء) کو مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع کیا تھا یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ خواجہ غلام غوث بے خبر کے بیان کے مطابق قطعات تاریخ وغیرہ چھپنے سے قبل ہی خریدار مال اٹھانے لگے تھے۔ دوسری بار یہ مجموعہ تقریباً سوا نو برس کے بعد ۲۰ صفر ۱۲۹۵ھ (۲۳ فروری ۱۸۷۸ء) کو مطبع نارائنی دلی میں چھپ کر شائع ہوا اس کے چند مہینوں کے بعد ستمبر ۱۸۷۸ء مطابق رمضان ۱۲۹۵ھ میں منشی نول کشور نے اپنے مطبع کی کانپور شاخ سے اس کا پہلا نول کشوری ایڈیشن شائع کیا۔ یہ ایڈیشن انیس سطری مسطر کے ۱۸۱ صفحات پر مشتمل ہے اصل متن صفحہ (۱۸۵) کی چھٹی سطر پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد حکیم غلام مولیٰ قلق میرٹھی کی تقریظ جو طبع اول میں بھی شامل ہے، نقل کی گئی ہے آخر میں مندرجہ ذیل "خاتمۃ الطبع" درج ہے۔

> خدا کا شکر بے پایاں ہے کہ ان دنوں ایک مجموعہ رقعات اردو زبان میں ہندی جس کا نام عود ہندی ہے، چکیدۂ خامۂ سحر نگار شاہ اقلیم انشا پردازی و سخنوری حضرت نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلوی جو پہلے شائقین کی تلاش سے مدون ہو کر مطبع مجتبائی میرٹھ میں طبع ہوا تھا اب باقی نہیں رہا لہٰذا فی الحال حسب اصرار اہل شوق مطبع نامی سرچشمۂ فتوت جناب منشی نول کشور صاحب دام اقبالہ مقام کانپور ماہ ستمبر ۱۸۷۸ء مطابق ماہ رمضان المبارک ۱۲۹۵ھ ہجری کے رنگ انطباع سے روکش مرقع مانی ہوا۔ رنگ آرائے روزگار پسندیدہ

عالم فرمادے گا" (ص ۱۸۰)

"عودِ ہندی" کا دوسرا نول کشوری ایڈیشن ستمبر ۱۸۸۱ء مطابق شوال ۱۲۹۸ھ میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ اکیس سطری مسطر کے (۱۸۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے تمام اندراجات اولی الذکر ایڈیشن کے مطابق ہیں۔ خاتمۃ الطبع میں صرف اتنا فرق ہے کہ "طبع ہوا تھا" اور "باقی نہیں رہا" کے درمیان لفظ "اب" موجود نہیں اور "دام اقبالہٗ" کے بعد" میں باہتمام لالہ بشیشر دیال" کا اضافہ کر دیا گیا ہے؛ نیز تاریخ طباعت بدل کر "بماہ ستمبر ۱۸۸۱ء مطابق ماہ شوال ۱۲۹۸ھ" بنا دی گئی ہے۔ اس خاتمے سے یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ یہ اس مطبع سے شائع ہونے والا دوسرا ایڈیشن ہے منشی نول کشور کی زندگی میں ان کے مطبع سے "عودِ ہندی" کا تیسرا اور آخری ایڈیشن مئی ۱۸۸۷ء مطابق شعبان ۱۳۰۴ھ میں شائع ہوا۔ اس کا مسطر اکیس سطری اور تعداد صفحات (۱۸۲) ہے۔ خاتمے میں حسب ضرورت چند تبدیلیاں کی گئی ہیں جن کا اندازہ مندرجہ ذیل تلخیص سے کیا جا سکتا ہے:۔

"خدا کا شکر ہے کہ مجموعۂ رقعات اردو زبان یعنی عودِ ہندی جلیدہ ..... میرٹھ میں طبع ہوا تھا اور بعد ازاں اسی مطبع میں طبع ہو کر نظر افروز شائقین ہو چکا ہے، اب بارِ دوم مطبع نامی ...... دام اقبالہٗ میں بمقام کانپور بماہ مئی ۱۸۸۷ء مطابق ماہ شعبان المعظم ۱۳۰۴ھ ..... پسندیدۂ عالم فرمادے" (ص ۱۸۱)

اس خاتمے میں متذکرہ ایڈیشن کو اشاعت دوم قرار دیا گیا ہے لیکن جیسا کہ سطور بالا میں پیش کردہ تفصیلات سے واضح ہے، یہ مطبع نول کشور کانپور سے شائع ہونے والا تیسرا ایڈیشن ہے پہلے دو نول ایڈیشنوں کے برخلاف اس ایڈیشن کے آخر میں خاتمے کے بعد منشی بھگوان دیال عاقل ایجنٹ مطبع کے کہے ہوئے دو قطعات تاریخ کا اضافہ کیا گیا ہے (ص ۱۸۲) جن میں سے پہلے قطعے کے مادۂ تاریخ "زہے مرغوب دل" سے سال ہجری اور دوسرے قطعے کے مادے "چہ عجب رقعات غالب" سے سنہ عیسوی برآمد ہوتا

ہے۔

مطبع نول کشور سے شائع شدہ تصانیف غالب کے یہ ایڈیشن صحت متن کے اعتبار سے پوری طرح قابلِ اعتماد نہیں، تاہم دوسرے مطابع کی چھاپی ہوئی ان کی کئی کتابوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ "قاطع برہان" کے بارے میں خود غالب کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ان کی سابقہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصنیفات کے مقابلے میں اغلاطِ کتابت کا تناسب بہت کم تھا، اس کے باوجود انھیں اس کے لیے بھی "غلط نامہ" مرتب کرنے کی زحمت اٹھانا پڑی تھی۔ نواب علاء الدین احمد خاں علائی کو ۱۹ فروری ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> تمھارے پاس جو "قاطع برہان" پہنچی ہے، اگر چھاپے کی ہے تو صحیح ہے جہاں تردد ہو غلط نامہ ملحقہ میں دیکھ لو زیادہ انکشاف منظور ہو، مجھ سے پوچھ لو۔ اگر قلمی ہے تو درجہ اعتبار سے ساقط ہے، اس کو میری تالیف نہ سمجھو بلکہ مجھ کو مول لے لو اور اس کو پھاڑ دو

کلیاتِ فارسی کے بارے میں غالب نے اپنا تاثر میر مہدی مجروح کے نام ۲۳ اگست ۱۸۶۳ء کے خط میں مختصراً ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

> "کلیات فارسی کا پہنچا مجھ کو معلوم ہوا میاں اس میں اغلاط بہت ہیں۔

بار بار کی اشاعت کے باعث توجہ اور عدم توجہ کی نسبت سے مختلف ایڈیشنوں میں ان غلطیوں کا تناسب بھی کم و بیش ہوتا رہا لیکن یہ نقص اپنے تمام مضمرات کے باوجود اتنا اہم نہیں کہ اس کی وجہ سے تصانیف غالب کے ان نول کشوری ایڈیشنوں کی اہمیت و افادیت سے انکار کر دیا جائے۔ بہ حیثیت مجموعی ان مطبوعات نے غالب اور نگارشاتِ غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کی تسکینِ ذوق و سیرابیِ شوق میں نمایاں حصہ لیا ہے، اس لیے جب تک غالب کی یہ تصانیف اور ان کے قدرشناس باقی ہیں منشی نول کشور غالب اور غالب شناسوں کے محسنین میں شمار کیے جاتے رہیں گے

حواشی

۱ے بحوالہ "منشی نول کشور" مضمون از جناب نادم سیتاپوری، مشمولہ ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ شمارہ ماہ اپریل ۱۹۶۵ء۔ ص ۸

۲ے اردو خطوط کے تمام اقتباسات خطوط غالب مرتبہ مولانا غلام رسول مہر شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، طبع سوم (۱۹۶۲ء) سے نقل کیے گیے ہیں

۳ے بحوالہ مضمون "ذکر غالب ۱۸۶۲ء کے اودھ اخبار میں" مشمولہ سہ ماہی "غالب نامہ" جلد ۱ شمارہ ۳-۴ ص ۲۲

۴ے بحوالہ مکتوب بنام نواب یوسف علی خاں ناظم "مکاتیب غالب" طبع دوم ۱۹۴۳ء ص ۲۱

۵ے بحوالہ "غالب نامہ" جلد ۱، شمارہ ۳، ۴ ص ۲۴، ۲۵

۶ے ایضاً۔ بحوالہ "غالب نامہ" ص ۲۶، ۲۷

۷ے ایضاً۔ بحوالہ "غالب نامہ" ص ۲۹، ۳۰

۸ے ایضاً بحوالہ "غالب نامہ" ص ۳۱

۹ے ایضاً بحوالہ "غالب نامہ" ص ۳۲

۱۰ے غالباً اس قصیدے سے "قصیدہ در مدح لارڈ ڈالگن" مراد ہے جو مارچ ۱۸۶۳ء میں کہا گیا تھا اور کلیات میں شامل نہیں ہو سکا۔

۱۱ے ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بیان کے مطابق "قاطع برہان" کی کتابت مشہور شاعر امیر اللہ تسلیم نے کی تھی۔ (غالب اور مطالعۂ غالب شائع کردہ سکینہ پبلشنگ ہاؤس دہلی ص ۲۰۰) ممکن ہے کہ کلیات کے کاتب بھی وہی ہوں تسلیم نواح فیض آباد میں ایک گانو منگلیسی کے رہنے والے تھے ان کا شمار نول کشور پریس کے بہترین کاتبوں میں ہوتا تھا۔

۱۲ے بحوالہ "تحقیقی نوادر" از ڈاکٹر اکبر حیدری، شائع کردہ اردو پبلشرز لکھنؤ

مارگ لکھنؤ طبع ۱۹۷۴ء ص ۳۶۶۔

۱۴؎ ممکن ہے کہ یہ خط منشی صاحب کے فرزند کی ولادت کی تہنیت میں لکھا گیا ہو جو اصغر علی خاں نسیم کے قطعہ تاریخ کے بموجب ۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۱ء) کا واقعہ ہے۔

۱۵؎ ۱۶؎ بحوالہ "اردوئے معلیٰ" مرتبہ جناب مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اپریل ۱۹۷۰ء جلد سوم ص ۱۱۰۶ تا ۱۱۰۸۔

۱۷؎ یہاں غالب سے سہو ہوا ہے، اودھ اخبار کی سالانہ قیمت چوبیس روپے نہیں، بارہ[12] روپے تھی۔

۱۸؎ بحوالہ "تحقیقی نوادر" ص ۳۶۳

۱۹؎ یہ قصیدہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے ؎

بیا کہ مدحِ خداوندِ داد گر گویم
از آنچہ گفتم ازیں پیش، بیشتر گویم

۲۰؎ غالب نے علائی کے نام ۲ر دسمبر ۱۸۶۳ء کو لکھے ہوئے جس خط میں پہلی بار منشی نولکشور سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے، اس کے آخر میں تاریخ عیسوی کے ساتھ سنہ لکھنے کی بجائے "سال کیا غضب ہے ہے" لکھا ہے اور اس کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ "یہ گویا تاریخِ وفات نواب گورنر جنرل لارڈ الگن بہادر کی ہے" اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت الگن کی وفات ایک اہم اور تازہ موضوعِ گفتگو تھی۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اسے ۲۰ر نومبر ۱۸۶۳ء کا واقعہ قرار دیا ہے (مکاتیب غالب، طبع دوم حواشی ص ۱۴)

۲۱؎ یہ قصیدہ بعد میں "سبد چین" مطبوعہ مطبع محمدی دہلی، طبع ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ (اگست ۱۸۶۷ء) میں شائع ہوا۔

۲۲؎ بحوالہ "تحقیقی نوادر" ص ۳۶۷، ۳۶۸

۲۳؎ ایضاً بحوالہ "تحقیقی نوادر" ص ۳۷۱، ۳۷۲

۲۳ھ "ساطع برہان" کے زمانہ تصنیف و طباعت کے بارے میں جناب مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی تحریر فرماتے ہیں۔

"ساطع برہان (تالیف ۱۲۷۶ھ) ..... مطبع ہاشمی میرٹھ سے ۱۲۸۳ھ میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب میرے پاس ہے"

(عود ہندی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع ۱۹۶۷ء، حاشیہ ص ۳۸۷)

اپنے اس بیان کے برخلاف مولانا موصوف نے "اردوئے معلّٰی" میں کتابیات کے ذیل میں اس کا سالِ طباعت ۱۲۸۰ھ لکھا ہے (جلد سوم ص ۱۱۰۸) یہ دونوں بیانات تصحیح طلب ہیں۔ "ساطع برہان" مرزا رحیم بیگ کی اپنی تحریر کے مطابق ۱۲۷۹ھ (۶۳-۱۸۶۲ء) کی تصنیف ہے انھوں نے اس کی تاریخ ترتیب مندرجہ ذیل قطعے میں نظم کی ہے۔

چوں گفت مرتب ایں رسالہ   باجملہ دلیل و بحثِ نادر
آنگہ بہ رحیم گفت ہاتف   تاریخ "بدائع النظائر"

۱۲۷۹ھ

تاریخ الطباع کے دو قطعات نام جس اقبال نے کہے تھے۔ ان دونوں قطعوں کے بموجب صحیح سال طباعت ۱۲۸۲ھ ہے ان میں سے پہلا قطعہ درج ذیل ہے۔

مطبوع شد چوں ساطع برہانِ میرزا یم   از اہتمام ملّا ہاشم بطرزِ دلکش
اقبال بے تردد از فیضِ ہاتفِ غیب   "مرغوبِ دل" نوشتم تاریخِ انطباعش

۱۲۸۲ھ

نواب کلب علی خاں کے نام ۲۳ اگست ۱۸۶۵ء (۱۲ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ) کو لکھے ہوئے غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس تاریخ سے پہلے "ساطع برہان" کے جواب میں "نامہ غالب" چھپوا کر شائع کر چکے تھے اس بنا پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ "ساطع برہان" ۱۲۸۲ھ کے بالکل ابتدائی

دنوں میں یعنی ۲۷ مئی ۱۸۶۵ء کے بعد اور اگست ۱۸۶۵ء سے قبل شائع ہوئی تھی۔

۲۵ "اودھ اخبار" میں "نامۂ غالب" کے سالِ اشاعت کے سلسلے میں دو مختلف بیانات ملتے ہیں۔ پہلا بیان جناب فاضل لکھنوی کا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں

نامۂ غالب..... مطبع محمدی دہلی میں غالباً اگست ۱۸۶۵ء میں پہلی مرتبہ اور اس کے بعد اسی سال اودھ اخبار کی دو اشاعتوں (۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر) میں شائع ہوا۔ جو میری نظر سے گزرا ہے۔

(عودِ ہندی) شائع کردہ مجلس ترقی ادب، لاہور، حاشیہ

ص ۲۵۷) دوسرا بیان مولانا غلام رسول مہر کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

غالب نے "نامۂ غالب"..... کے تین سو نسخے مطبع محمدی دہلی میں چھپوا کر اپنے دوستوں میں تقسیم کیے بعد ازاں یہ "نامہ" اودھ اخبار کی دو اشاعتوں (۱۰ اکتوبر، ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۹ء) میں من و عن شائع ہو گیا۔

(خطوطِ غالب طبع سوم ص ۶۱۲)

مولانا مہر کے اسی بیان کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان الفاظ میں دہرایا ہے۔

یہ "نامۂ غالب" عام اس وقت ہوا جب ۱۸۶۹ء میں اس کا متن اودھ اخبار میں بالاقساط شائع ہوا پہلی قسط ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے اخبار میں اور دوسری قسط ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے اخبار میں شائع ہوئی۔

(غالب اور مطالعہ غالب مطبوعہ دہلی ص ۲۰۰)

"اودھ اخبار کے متعلقہ شمارے ہماری دسترس میں نہیں، تاہم غالب پر کام کرنے والے دو ممتاز ادیبوں کے ان بیانات میں سنہ اشاعت کے اختلافات کے علاوہ ایک اور بھی قباحت موجود ہے جو ناقابلِ قبول

کرنے سے مانع ہے۔ اودھ اخبار" اس زمانے (۱۸۶۹ء) تک ہفتے میں ایک بار ہر چہارشنبہ کو شائع ہوا کرتا تھا، جب کہ پیشِ بالا تاریخوں میں سے ۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو سہ شنبہ اور ۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو یکشنبہ کا دن تھا۔ اس کے برخلاف ۱۸۶۶ء میں یہ دونوں تاریخیں چہارشنبہ کے دن پڑی تھیں، اس لیے صحیح سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۹ء کی بجائے ۱۸۶۶ء ہی معلوم ہوتا ہے۔ اودھ اخبار کے ابتدائے سال ۱۸۶۳ سے دسمبر ۱۸۶۵ تک مسلسل شمارے ڈاکٹر اکبر حیدری کی نظر سے گزر چکے ہیں (تحقیقی نوادر ص ۳۷۸) اور انھوں نے ان کی مدد سے "مرزا غالب اور اودھ اخبار" کے زیرِ عنوان ایک مضمون بھی لکھا ہے جو ان کے مجموعۂ مضامین "تحقیقی نوادر" میں شامل ہے۔ اس مضمون میں "نامۂ غالب" کا ذکر موجود نہیں۔ اگر یہ رسالہ ۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کے شماروں میں شائع ہوا ہوتا تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے۔ یہ صورتِ حال بھی ضمناً ہمارے قیاس کی تائید کرتی ہے۔

۲۶ء تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو "دعائے صباح" طبع ثانی (دسمبر ۱۹۷۷ء) شائع کردہ جناب کالی داس گپتا رضا و "متعلقاتِ غالب" از جناب کالی داس گپتا رضا ص ۱۰۰ تا ۱۵۱

۲۷ء بہ حوالہ "تحقیقی نوادر" ص ۳۹۰

۲۸ء "کلیاتِ نثرِ غالب" کے اس ایڈیشن کے بارے میں ابتدائی اطلاع جناب مالک رام کے مضمون "غالب اور لیتھو" (مشمولہ "نذرِ مقبول" مطبوعہ مطبع نظامی لکھنؤ، ۱۹۷۰ء) سے ملی تھی۔ جناب کالی داس گپتا رضا کے مکتوب موسومہ راقم مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۸۶ء سے اس کے متعلق بعض ضروری تفصیلات کا علم ہوا۔ بعد ازاں صولت پبلک لائبریری رام پور میں اس کے ایک نسخے سے استفادے کا موقع ملا۔

۲۹ء مکتوب رضا موسومہ راقم مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۸۶ء

۳۰ء بہ حوالہ "کلیاتِ دہبی" موسوم بہ "مرقعِ اثرِ رنگ" از منشی شیو پرشاد دہبی مینیجر اودھ اخبار، مطبوعہ مطبع نول کشور، طبع اگست ۱۸۸۰ء۔

۱۳۱۔ بہ حوالہ "عودِ ہندی" مرتبہ جناب مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ تعارف از مرتب ص ۶۹۔

ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ، منشی نول کشور نمبر، نومبر، دسمبر ۱۹۸۰ء

Scanned with CamScanner

غالب سے منسوب ایک شعر

اردو کے ان اشعار میں جو شہرت و مقبولیت کی حدِ کمال کو پہنچ کر زبان زدِ خاص و عام ہو چکے ہیں، یہ شعر بھی شامل ہے ؎

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

بیشتر مشہور اور زبان زد اشعار کی طرح اس شعر کے بارے میں بھی آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کس کی تصنیف ہے، البتہ بعض غیر محتاط حضرات اسے تحریر و تقریر میں غالب سے منسوب کرتے آئے ہیں۔ غالب کے متداول دیوان میں اس زمین میں چھ اشعار کی ایک غزل موجود ہے نسخۂ حمیدیہ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ چھ اشعار سات سات اشعار کی دو غزلوں سے انتخاب کر کے اس دیوان میں شامل کیے گئے ہیں۔ ان غزلوں کے مقطعوں میں سے ایک میں اسد اور دوسرے میں غالب تخلص نظم ہوا ہے جو بظاہر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دونوں غزلیں مختلف اوقات میں کہی گئی تھیں زیرِ بحث شعر نہ تو ان دونوں غزلوں میں سے کسی غزل میں موجود ہے اور نہ غالب کی زندگی میں شائع شدہ متداول دیوان کے کسی نسخے میں ملتا ہے اب تک دریافت شدہ متعدد قلمی نسخوں میں سے بھی کسی نسخے میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ بعد میں مطبوعہ نسخوں میں سے جس نسخے میں اسے غالباً سب سے پہلے کلامِ غالب کی حیثیت سے جگہ دی گئی، وہ نظامی پریس بدایوں سے شائع شدہ دیوانِ غالب کا چوتھا ایڈیشن ہے۔ نظامی پریس سے دیوانِ غالب کا پہلا

ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۱۵ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان اس کے مزید دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ چوتھا ایڈیشن جس کا دیباچہ ۱۴؍ جولائی ۱۹۲۱ء کو لکھا جا چکا تھا سرورق کے اندراج کے مطابق ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کے صفحہ ۲۵۵ پر "وہ اشعار جو دیوان مروجہ میں نہیں ہیں" کے زیر عنوان مندرج اشعار میں زیر بحث شعر بھی شامل ہے۔ نظامی صاحب نے ذیلی حاشیے میں اس شعر کے متعلق فرمایا ہے۔

یہ شعر اکثر لوگوں کی زبان پر ہے لیکن اس کے اصل مصنف کے نام سے لوگ نا آشنا ہیں۔ بعض اسے میر تقی میر کا شعر بتاتے ہیں، بعض مرزا غالب کا۔ لیکن کلیات میر میں اس کا پتہ نہیں، نہ دیوان غالب میں ہے۔ لیکن حضرت شوکت بلگرامی نے اس شعر کی بابت اردوئے معلی علی گڑھ مطبوعہ ستمبر ۱۹۱۰ء میں اپنے ایک بزرگ کے حوالے سے لکھا تھا کہ اپنی اس مشہور غزل "قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا" میں بعد طبع دیوان مرزا نے اس شعر کا اضافہ کیا تھا۔ عجب نہیں کہ حضرت شوکت کا یہ بیان صحیح ہو کیونکہ اس شعر کے تیور بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ مرزا جیسے قادر الکلام شاعر کے قلم سے نکلا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس ایڈیشن کے منظر عام پر آنے کے بعد جلد ہی نظامی صاحب پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ شعر غالب کے بجائے کسی اور شخص کی تصنیف ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں جب انھوں نے عام سائز اور پاکٹ سائز میں اس دیوان کے دو نئے ایڈیشن شائع کئے تو اس شعر کو متفرقات کے زمرے سے خارج کر دیا۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ اس قسم کی غلطیاں جب ایک بار کسی کتاب میں راہ پا جاتی ہیں تو اصلاح و تصحیح کی کوششوں کے باوجود کسی نہ کسی گوشے سے برابر ان کا اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ نسخہ نظامی کے اگلے ایڈیشنوں سے اس شعر کے اخراج کے بعد بھی غالب سے اس کے انتساب کا سلسلہ بدستور قائم ہے۔ ۱۹۲۲ء سے اب تک تقریباً ساٹھ سال کی مدت میں دیوان غالب کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اگر تلاش کی جائے تو ان میں دو چار اشاعتیں ایسی ضرور مل

جائیں گی جن میں یہ شعر بھی موجود ہوگا۔ اس وقت ایوان یکیفی، ۶۰ نخاس کہنہ، الہ آباد کا شائع کردہ ایک خوبصورت ایڈیشن ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس میں کسی جگہ سال اشاعت درج نہیں لیکن آخری صفحے کی ایک تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۶۹ء کی غالب صدی تقریبات کے بعد شائع ہوا ہے صفحہ ۱۳ سے ۲۱۵ صفحہ تک اس کے تمام اندراجات متداول دیوان کے مطابق ہیں۔ صفحہ ۲۱۶ سے صفحہ ۲۲۸ تک وہ اشعار و قطعات جو دواوین مروجہ میں نہیں ہیں" درج کیے گئے ہیں اور صفحہ ۲۲۹ سے صفحہ ۲۸۰ تک "قدیم اور نو دریافت نسخوں کا منتخب کلام" پیش کیا گیا ہے ان میں سے پہلے ضمیمے کے تحت صفحہ ۲۲۸ پر سب سے آخر میں زیر بحث شعر بھی موجود ہے۔ اس طرح ۱۹۲۲ء سے ماضی قریب تک غالب سے اس کے انتساب اور دیوان غالب میں اس کی شمولیت کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اس روایت کو محض اس کے عدم استناد اور بے اعتباری کی بنا پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ غالب کی بے پناہ مقبولیت کے پیش نظر ہر قاری سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ان کے دیوان کے کسی ایسے نسخے ہی کی طرف رجوع کرے جو ان کے تمام کلام کا جامع اور الحاق و تصرف سے پاک ہو۔ فی الحقیقت ایسا کوئی نسخہ اب تک شائع بھی نہیں ہوا ہے۔

اس حقیقت تک رسائی کے بعد کہ یہ شعر غالب کی تصنیف نہیں ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کا مصنف کون ہے؟ اس سوال کا جواب پیش کرنے سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ زبان زدِ عام کی معراج تک پہنچنے کے لیے بیشتر اشعار کو تحریف و تصرف کے ایک ناگزیر اور غیر محسوس عمل سے گزرنا پڑتا ہے حتیٰ کہ تحریر و تقریر میں آگے دن ان کا استعمال کرنے والوں کے لیے اس بات کا مطلق اہمیت باقی نہیں رہ جاتی کہ ان کا مصنف کون ہے اور اس نے اپنے تاثرات کے اظہار کی غرض سے جس پیرایۂ بیان یا مجوزہ الفاظ و تراکیب کا انتخاب کیا تھا، اس میں کس حد تک تبدیلی آ چکی ہے! اس قسم کے مشہور اشعار میں سے یہ چند شعر بطور نمونہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میرؔ!
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ!
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

پہلا شعر اس مشہور مرصع غزل میں بطور مقطع شامل ہے، جو منتخبات کے کئی مجموعوں میں میرؔ کے نام سے جگہ پا چکی ہے، لیکن فی الحقیقت مختلف شعراء کے منتخب اشعار پر مشتمل ہے۔ علامہ شبلیؔ نے "شعر العجم" کی پہلی جلد میں فردوسی کی وفات کے بیان میں یہی شعر امیرؔ تخلص کے ساتھ نقل کیا ہے۔ لیکن یہ نہ میرؔ کا طبع زاد ہے، نہ امیرؔ کی تصنیف، اس کے اصل مصنف میر صاحب کے فرزند اصغر میر کلو عرشؔ ہیں اور ان کے مطبوعہ دیوان کے مطابق اس کی اصل صورت حسب ذیل ہے ؎

زندگی بھر نہ ملا، قبر پہ آیا آخر
کی مرے درد کی عیسیٰ نے دوا میرے بعد

پہلے شعر کی طرح دوسرا شعر بھی جو مولانا ابوالکلام آزاد کے بقول "زبانوں پر چڑھ کر بہت پامال ہو چکا ہے" تخلص کی موجودگی کی وجہ سے عام طور پر میرؔ کی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت نواب محمد یار خاں امیرؔ رئیس ٹانڈہ ضلع رام پور کا نتیجۂ فکر ہے۔ امیرؔ نے اسے ان الفاظ میں نظم کیا

تھا:

شکست و فتح میاں، اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

تیسرا شعر مرزا عظیم بیگ عظیم دہلوی کی تصنیف ہے۔ یہ اس مخمس کا جز ہے جو انھوں نے انشاؔ سے معارضے کے دوران بعض اعتراضات بالخصوص "بحر رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے" کے جواب میں نظم کیا تھا۔ حکیم قدرت اللہ قاسم نے "مجموعۂ نغز" میں اسے اس طرح نقل کیا ہے:

گرتے ہیں اپنے زور میں شہ زور مثل برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

چوتھے شعر کے بارے میں بھی شاید کم ہی لوگوں کو یہ بات معلوم ہو کہ یہ نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے۔ ان کے مطبوعہ دیوان غزلیات میں یہ شعر جس صورت میں نقل ہوا ہے، وہ حسب ذیل ہے:

تھا ارادہ تری فریاد کریں حاکم سے
وہ بھی اے شوخ ترا چاہنے والا نکلا

پانچواں شعر استاد ذوقؔ کا ہے اور ان کے دیوان کے قدیم مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں اس طرح منقول ہے۔

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

مولانا محمد حسین آزاد نے جن کے بارے میں محققین کی عام طور پر یہ رائے ہے کہ انھوں نے استاد کے کلام میں دیدہ دانستہ تحریف کی ہے، اپنے مرتبہ کلیات ذوقؔ میں اسے اس طرح نقل کیا ہے ؎

گل کھلا کچھ تو بہاریں اے صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ان مثالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے زبان زد اشعار میں ترمیم و تصرف کے امکانات کتنے قوی ہوتے ہیں اور ان کے زیر اثر کسی شعر کی ہیئت اصلی کس حد تک متغیر ہو سکتی ہے راقم السطور کا خیال ہے کہ غالب کے نام سے مشہور زیر بحث شعر بھی تحریف و ترمیم کے اسی غیر محسوس عمل سے گزر کر ہم تک پہنچا ہے اگر یہ قیاس صحیح ہے اور بظاہر اس کے غلط ہونے کا امکان بہت کم ہے تو اس کی صورت حسب ذیل ہے :

ایک تصویر کسی شوخ کی، اور نامے چند
گھر سے عاشق کے پس مرگ یہ ساماں نکلا

یہ شعر منیر شکوہ آبادی کے پوتے عاشق حسین بزم اکبر آبادی کی تصنیف ہے اور جس غزل سے متعلق ہے، وہ اگست ۱۹۱۰ء سے قبل کہی گئی تھی ۔ راقم السطور کو یہ غزل ایک قدیم گلدستے "آئینہ مشاعرہ" میں دستیاب ہوئی ہے جو ۱۸ اگست ۱۹۱۰ء کو بھوپال میں مولانا محمد اسماعیل کے مکان پر منعقدہ ایک یادگار طرحی مشاعرہ کی غزلوں پر مشتمل ہے اور منشی عبدالعزیز خاں کے زیر اہتمام عزیزی پریس آگرہ میں چھپ کر شائع ہوا ہے ۔ منتظمین کی دعوت پر اس مشاعرے کے لیے باہر سے متعدد شعراء نے غزلیں کہہ کر بھیجی تھیں جو وقتِ مقررہ پر سرِ محفل پڑھ کر سنائی گئیں ۔ مرتب گلدستہ سرور قادری بدایونی نے ابتدا میں اختصار کے ساتھ ان بیرونی شعراء کا تعارف کرایا ہے ۔ بزم اکبر آبادی بھی شعرا کے اسی زمرے میں شامل تھے ۔ ان کے متعلق جناب قادری نے لکھا ہے ۔

> مرزا عاشق حسین صاحب اکبر آبادی، نبیرۂ منیر مرحوم ۔ آپ کہنہ مشق شاعر اور صاحبِ دیوان ہیں ۔ آپ کا کلام بہت پر مغز ہے فی الحال ریاست رامپور میں درباری شاعر ہیں (ص ۴)

قارئین کی دلچسپی کے لیے بزم کی یہ مکمل غزل اس گلدستے سے ذیل میں نقل کی جاتی ہے :-

یوں تو دلچسپ بہت عالمِ امکاں نکلا
جب کیا غور تو اک خواب پریشاں نکلا
اشک آنکھوں سے، جگر سینے سے، نالے منہ سے
یہ تو سب ہجر میں نکلے، یہ نہ ارماں نکلا
کسی کافر کا غمِ ہجر گیا جان کے ساتھ
تا دمِ مرگ نہ اس گھر سے یہ مہماں نکلا
غنچۂ دل میں ہزاروں نظر آئے گلِ داغ
جس کو ایک پھول سمجھتے تھے گلستاں نکلا
ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند
گھر سے عاشق کے پسِ مرگ یہ ساماں نکلا
دل کی آنکھوں سے جو دیکھا تو یہ معلوم ہوا
جس کو ہم ڈھونڈتے تھے، قربِ رگِ جاں نکلا
لاکھ یاروں نے کفن دے کے مجھے دفنایا
میں وہ مجنوں ہوں کہ پھر قبر سے عریاں نکلا
شیخ جو خلد کے باغوں کی تمنا کرتے تھے
ایک تو ان میں بھی کافر کا گلستاں نکلا
ہو کوئی تازہ ادا، بزم! کہ انداز نیا
جو بھی نکلا، وہ مری جان کا خواہاں نکلا

اس غزل کی اشاعت کا زمانہ معلوم ہو جانے کے بعد بعض ذہنوں میں یہ سوال ابھر سکتا ہے کہ جو شعر ۱۸ اگست ۱۹۱۰ء کو کسی مشاعرے میں پڑھا گیا تھا اور اس کے بعد منظرِ عام پر آیا وہ ہئیت ظاہری کی اتنی نمایاں تبدیلی کے ساتھ اردوئے معلی کے ستمبر ۱۹۱۰ء کے شمارے میں کس طرح غالب سے منسوب کر دیا گیا۔
اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین رکھنا ہوگا کہ کسی خاص مشاعرے میں کسی

غزل کا پڑھا جانا ہرگز اس بات کے ثبوت کے لیے کافی نہیں کہ وہ غزل بطور خاص اسی مشاعرے کے لیے کہی گئی تھی بہت ممکن ہے کہ بزم یہ غزل اس سے بہت پہلے کہہ چکے ہوں اور اس کا یہ شعر سننے والوں کے ذہنوں پر اپنا پائیدار نقش ثبت کر کے قبول عام حاصل کر چکا ہو۔ راقم السطور ثاقب لکھنوی سے متعلق اپنے ایک مضمون میں جو ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ کے فروری ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے، یہ ثابت کر چکا ہے کہ ان کی ایک غزل جو ۲۳ مئی ۱۹۱۳ء کو جانسٹھ ضلع مظفر نگر کے ایک طرحی مشاعرے میں فکر تازہ کے طور پر پیش کی گئی تھی اور اسی تاریخ کے حوالے کے ساتھ شامل دیوان ہے اس کے بعض اشعار ۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء سے قبل اور بعض مارچ ۱۹۱۵ء کے آخری دنوں میں کہے گئے تھے۔ یہ مثال کسی خاص غزل کے زمانۂ تصنیف کے سلسلے میں اس قسم کے تمام شبہات کے ازالے کے لیے کافی ہے۔

غالب کی روز افزوں مقبولیت اور ان کی ذات یا کلام سے متعلق ہر نئی دریافت کی غیر معمولی پذیرائی کے باعث یہ بھی ہوتا رہا ہے کہ وقتاً فوقتاً کچھ لوگ کبھی بر بنائے تفنن و خوش طبعی اور کبھی جعل سازی کی نیت سے اپنے یا دوسروں کے نتائج طبع کو غالب سے منسوب کر کے تماشائے اہل نظر دیکھنے اور دکھانے کا سامان کرتے رہے ہیں اور غالب شناسوں نے، گو وقتی طور پر ہی سہی، ان کی ان کوششوں کو گراں قدر ادبی سوغات سمجھ کر والہانہ جوش و خروش کے ساتھ قبول بھی کیا ہے اس لیے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کسی خوش مذاق نے اور یہ خود جناب شوکت بلگرامی بھی ہو سکتے ہیں، بالارادہ بزم کے شعر میں تحریف کر کے اسے غالب کے شعری مزاج سے ہم آہنگ کرنے اور ان کے کلام کے طور پر شہرت دینے کی کوشش کی ہو بہر حال جب تک زیر بحث شعر کسی دوسرے شاعر کے کلام میں حرف بحرف اسی صورت میں دستیاب نہ ہو، اسے بزم کے شعر کی ترمیم یافتہ شکل سمجھنا چاہیئے۔

ماہنامہ "آج کل" (دہلی شمارہ دسمبر ۱۹۸۰ء)

تلامذۂ غالب پر ایک نظر

"تلامذۂ غالب" غالب کے ایک سو چھیالیس شاگردوں کا تذکرہ ہے جسے مشہور غالب شناس جناب مالک رام نے مرتب فرمایا ہے اور مرکز تصنیف و تالیف نکودر (پنجاب) نے شائع کیا ہے۔ مقدمے کی تاریخ تحریر ۵ اردسمبر ۱۹۵۷ء ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۵۷ء کے اواخر یا ۱۹۵۸ء کے اوائل میں شائع ہوکر منظر عام پر آئی ہوگی۔ فاضل مصنف نے حتی المقدور تمام وسائل معلومات سے کام لے کر اس تذکرے کو ہر اعتبار سے جامع اور مکمل بنانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ شعرا کے تذکروں اور دیوانوں، شاعروں کے گلدستوں اور دوسری متعدد کتابوں اور رسالوں سے اخذ مواد کے علاوہ بعض شعرا کے حالات اور کلام کی فراہمی میں ان کے پس ماندگان اور قریبی اعزہ سے بھی مدد لی گئی ہے۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے حالات کی تحقیق کے لیے سکندرآباد کی کوچہ گردی سے متعلق ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف موصوف نے اس مقصد کے حصول کے لیے حسب ضرورت سفر کی زحمتیں برداشت کرنے میں کبھی تامّل نہیں کیا ہے۔ تلاش و تحقیق کے ان تمام ذرائع سے استفادے کے باوجود بعض شاعروں کے بارے میں انھیں تسلی بخش معلومات حاصل نہیں ہوسکیں اور بعض کے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات میں نقائص باقی رہ گئے جس کا انھیں خود بھی اعتراف ہے۔

"تلامذۂ غالب" کی اشاعت کے بعد اس پر سب سے پہلا تبصرہ غالباً جناب تمکین کاظمی نے تحریر فرمایا جو ماہنامہ "تحریک" دہلی کے مارچ ۱۹۵۹ء کے شمارے میں

شائع ہوا تھا اس تبصرے میں کتاب کی متعدد خوبیوں کے پہلو بہ پہلو اس کی بعض خامیوں کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۵۹ء ہی میں دوسرا تبصرہ جناب نثار احمد فاروقی نے لکھا جو ان کے مجموعہ مضامین "تلاش غالب" (مطبوعہ ۱۹۶۹ء) میں شامل ہے۔ اس مضمون میں جناب مالک رام کی تحقیقی کاوشوں کے مناسب اعتراف کے ساتھ ان کے بیانات کی ان تمام خامیوں اور کوتاہیوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جنھیں بعض حالات میں اہم مآخذ تک نارسائی کا نتیجہ اور بعض صورتوں میں حقائق کی غلط تعبیر یا غلط فہمی پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ بعد کے زمانے میں، بالخصوص غالب صدی کے دوران بعض اہل قلم کی توجہات کے نتیجے میں اس کتاب کی کچھ اور غلطیاں واضح ہو گئیں اور موضوع سے متعلق کچھ نیا مواد بھی سامنے آیا۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مضامین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

(۱) غالب اور تلامذۂ غالب۔ تذکرہ بشیر میں، مشمولہ سہ ماہی "اردو" کراچی شمارہ خصوصی بیاد غالب بابت جنوری مارچ ۱۹۶۹ء۔

(۲) کچھ تلامذۂ غالب کے بارے میں۔ از جناب کلب علی خاں فائق رامپوری۔ سہ ماہی "اردو" شمارہ جنوری، مارچ ۱۹۶۹ء

(۳) کچھ تلامذۂ غالب کے بارے میں۔ از جناب کلب علی خاں فائق (لاہور)، ماہنامہ "ماہ نو" کراچی شمارہ جنوری، فروری ۱۹۶۹ء۔

(۴) تلامذۂ غالب۔ از ڈاکٹر وحید قریشی۔ ماہنامہ "ماہ نو" کراچی شمارہ جنوری، فروری ۱۹۶۹ء۔

(۵) "تلامذۂ غالب" کی تحقیقی غلطیاں۔ از ڈاکٹر حنیف الدین فریدی، مشمولہ "اردو تحقیق اور مالک رام" مرتبہ جناب شاہد ماہلی

کتاب اور اس کے موضوع گفتگو کے ان عمومی جائزوں کے پہلو بہ پہلو اس عرصے میں کئی ایسی کتابیں اور مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں جن میں کسی خاص علاقے کے شاگردوں یا انفرادی طور پر کسی خاص شاگرد کے کارناموں کا بالتفصیل جائزہ لیا

گیا ہے مستقل تصانیف سے قطع نظر مختلف رسالوں میں بکھرے ہوئے ان متعدد مضامین میں سے جو مضمون سوانحی اور تحقیقی نقطہ نظر سے اہمیت کے حامل ہیں، ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) مرزا غالب کے بنارسی تلامذہ۔ از خیر بہوروی۔ مشمولہ ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ شمارہ ماہ اگست ۱۹۶۵ء

(۲) شعرائے بریلی اور غالب۔ از ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب مشمولہ اسلامیہ کالج میگزین، بریلی شمارہ خصوصی بیاد غالب بابت ۷۰-۱۹۶۹ء

(۳) منشی بال مکند بے صبر۔ از ہری کشن راز۔ مشمولہ، ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ شمارہ ماہ ستمبر ۱۹۵۹ء۔

(۴) سید غلام حسنین قدر بلگرامی۔ از مرتضیٰ حسین بلگرامی مشمولہ ماہنامہ "آج کل" دہلی شمارہ اکتوبر ۱۹۶۳ء

(۵) میر مہدی مجروح۔ از شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ مشمولہ ماہنامہ "ماہ نو" کراچی شمارہ، جنوری۔ فروری ۱۹۶۹ء۔

(۶) ابوالفضل محمد عباس رفعت شیروانی۔ از پروفیسر عبدالقوی دسنوی مشمولہ سہ ماہی "اردو" کراچی شمارہ جنوری، مارچ ۱۹۶۹ء

(۷) غالب اور تفتہ۔ از سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی مشمولہ سہ ماہی "اردو" کراچی شمارہ جنوری۔ مارچ ۱۹۶۹ء

(۸) ولایت علی خاں ولایت و عزیز صفی پوری از راقم السطور حنیف نقوی مشمولہ دوماہی "اکادمی" لکھنؤ شمارہ ماہ ستمبر ۱۹۸۱ء

جناب تمکین کاظمی کے تبصرے کے علاوہ محولہ بالا تمام مضامین راقم السطور کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان جدید تحقیقات کے نتیجے میں "تلامذۂ غالب" کی بہت سی غلطیوں کی اصلاح ہو گئی ہے اور سابقہ معلومات پر متعدد اہم اور مفید اضافے بھی ہو گئے ہیں، تاہم کتاب کے مطالعے کے دوران اب بھی جابجا ترمیم کی

گنجائش اور اضافے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے پیش نظر معروضات کا محرک یہی احساس ہے۔ امید ہے کہ محترم مصنف ان کی جانب مناسب توجہ فرمائیں گے اور ان کی اس گراں قدر تصنیف کا اگلا ایڈیشن خوب سے خوب تر کی طرف پیش رفت کا ایک اعلیٰ نمونہ بن کر سامنے آئے گا۔

(۱) پیرجی، قمرالدین دہلوی:۔ غالب سے ان کے خصوصی روابط تھے۔ چنانچہ ۱۴ نومبر ۱۸۶۵ء کو رام پور سے مرزا شمشاد علی بیگ رضوان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "پیرجی بہت یاد آتے ہیں۔ ان کو دعا کہنا" دیوان غالب طبع سوم (مطبوعہ مطبع احمدی دہلی، ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ - ۲۸ جولائی ۱۸۶۱ء) کے خاتمے میں "مخلص وداد آئیں، میر قمرالدین" کا ذکر آیا ہے۔ اگر یہ میر قمرالدین اور پیرجی قمرالدین شخصِ واحد ہیں تو اس کا بھی حوالہ دیا جانا چاہیے۔

مرے دل کو ہو کس طرح سے مسرت — کہ اس بزم میں ہائے رضواں نہیں ہے
ہر اک شعر اس کا ہے گنج معانی — مقرر یہ غالب ہے شاداں نہیں ہے

ان اشعار کے نقل کرنے کے بعد لکھا گیا ہے کہ "رضوان سے شمشاد علی بیگ رضواں اور شاداں سے حسین علی خاں شاداں مراد ہیں۔ گویا یہ غزل ۱۸۷۶ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیانی زمانے میں لکھی گئی ہے" (ص ۵۹) حقیقت یہ ہے کہ یہ غزل دہلی کے ایک طرحی مشاعرے کے لیے کہی گئی تھی جو ماہ جون ۱۸۷۵ء میں منعقد ہوا تھا، اس کا گلدستہ "مشاعرہ دہلی" کے نام سے اکمل المطابع دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ پیرجی کی یہ غزل تیرہ اشعار پر مشتمل ہے، اور اس میں منقولہ بالا دونوں اشعار سے قبل یہ شعر بھی موجود ہے ؎

مرا دل بھی تاقب کے غم سے ہے نالاں — کہ دنیا میں اب وہ سخن داں نہیں ہے

(۲) سید مدد علی تپش اکبر آبادی:۔ مصنف کا بیان ہے کہ "تپش ۱۸۱۹ء میں آگرے میں پیدا ہوئے" (ص ۶۰) یہ اطلاع آگرے کے ایک مشاعرے کے گلدستے "شعر و سخن" کی ایک تحریر پر مبنی ہے جس میں خود تپش نے اپنی عمر

پچاسؔ سال بتائی ہے۔ یہ مشاعرہ راجہ بلوان سنگھ والیٔ کاشی کے دولت کدے پر ۱۰؍ رجب ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۶؍ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو منعقد ہوا تھا اور اس کے لیے یکم اگست ۱۸۶۹ء مطابق ۳ جمادالاولی ۱۲۸۶ھ کو ایک اشتہار جاری کر کے شعراء سے طرحی غزلوں کے ساتھ اپنے حالات بھی خود لکھ کر بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اولاً تو عمر کے متعلق سرسری نوعیت کے اس بیان کی بنیاد پر پوری قطعیت کے ساتھ کسی سنہ کا تعین نامناسب ہے، ثانیاً اس زمانے میں روزمرہ کے کاروبار میں سنہ عیسوی کے بجائے سنہ ہجری رائج تھا، اس لیے اس قسم کے حسابات میں اسی کا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ چنانچہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ "تفتہ ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۰-۲۱ء) کے قریب آگرے میں پیدا ہوئے"

(۳) منشی ہرگوپال تفتہ :۔ "گلشن ہمیشہ بہار" (مطبوعہ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق اپریل ۱۸۵۴ء) کے مولف نصر اللہ خاں قمر خویشگی خورجوی نے لکھا ہے کہ "چندے بہ تحصیل داریٔ کاشی پور ٹھاکر دوارہ ضلع مرادآباد در عمال ملازم بود حالا شنیدہ ام کہ بہ تخفیف در آمدہ" (ص ۹۹) منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی بھی ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء سے قبل مرادآباد کے زمانۂ قیام کی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ "من داو اکثر باہم طبع آزمائی کردہ ایم" اس کے علاوہ خویشگی کی اطلاع کے مطابق تفتہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ نئے ایڈیشن میں ان دونوں اطلاعات کا اضافہ ہونا چاہیے۔

فاضل مصنف فرماتے ہیں کہ "تفتہ نے ...... ۲۰ ستمبر ۱۸۷۹ء (۱۵ رمضان ۱۲۹۶ھ کو سکندرآباد ہی میں وفات پائی" (ص ۶۳) لیکن محمد علی خاں انجم ساکن شیخ پور ضلع مونگیر کے قطعات تاریخ کے بموجب ان کا انتقال دہلی میں تپ وبائی کے عارضے میں ہوا تھا۔ ان قطعات کے متعلقہ اشعار درج ذیل ہیں ؎

ہاں مگر تفتہ مرد در دہلی	مرد و زن اشک ریز ہمی آیند
سال او ریختہ از لب انجم	بردہ نام سخنوری از ہند

۱۲۹۵ + ۱ = ۱۲۹۶

انتقال از تپ وبائی کرد — تفتہ شاگرد حضرت غالب

گفت سال وفات او انجم — وائے سید حیف نائب غالب

۱۲۹۶ھ

یہ قطعات "اودھ اخبار" کے ۱۷ دسمبر ۱۸۷۹ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے ممکن ہے کہ انجم کو تفتہ کے انتقال کی اطلاع بھی اسی اخبار سے ملی ہو۔ بہر حال بمقام انتقال کے سلسلے میں یہ معاصر شہادت دوسرے بیانات کے مقابلے میں قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

(۴) مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب:۔ محترم مصنف نے ثاقب کے حالات زندگی کے تحت ان کے چار صاحبزادوں شجاع الدین احمد خاں تاباں، بہاء الدین احمد خاں طلب، سراج الدین احمد خاں سائل اور ممتاز الدین احمد خاں آئل کا بھی ذکر کیا ہے۔ حاشیے میں ان میں سے صرف تاباں اور سائل کی تاریخ ولادت و وفات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ "اودھ اخبار" مورخہ ۱۱ فروری ۱۸۶۳ء کے مطابق بہاء الدین احمد خاں کی ولادت ۱۳ شعبان المعظم ۱۲۷۹ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۸۶۳ء کو شنبہ کے دن شام کے وقت ہوئی تھی۔ "شاعر دہلی" (بابت ماہ جون ۱۹۰۸ء) کے مطابق ان کا ابتدائی تخلص باطل تھا۔ چوتھے صاحبزادے ممتاز الدین احمد خاں آئل کے بارے میں محترمہ حمیدہ سلطان احمد کا بیان ہے کہ وہ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے اور کثرت شراب نوشی کے نتیجے میں پھیپھڑے گل جانے کے باعث عین عالم جوانی میں انتیس ۲۹ سال کی عمر میں دسمبر ۱۸۹۶ء میں انتقال کیا تھا۔ اس کے برخلاف ہمارا خیال یہ ہے کہ ممتاز الدین احمد خاں بہ گمان غالب تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۸۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس قیاس کے بموجب آئل کی ولادت ۱۲۸۷ھ (۷۱-۱۸۷۰ء) کا واقعہ قرار پاتا ہے۔ دسمبر ۱۸۹۶ء مطابق رجب ۱۳۱۴ھ میں انتقال کے وقت ان کی عمر بحساب سنہ ہجری ستائیس سال ہوگی۔

سائل کے متعلق مالک رام صاحب کا ارشاد ہے کہ مرزا سراج الدین احمد خاں سے (ان کی) تاریخ ولادت (۱۰ شوال ۱۲۸۰ھ) برآمد ہوتی ہے (حاشیہ ص ۲۱۷)

سنہ مطلوبہ مرزا سراج الدین احمد خاں کی بجائے "مرزا ج سراج الدین احمد خاں" سے برآمد ہوگا آگے چل کر ۵ ستمبر (۷ شوال ۱۳۰۶ھ) کو انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۷ سال بتائی گئی ہے۔ حالانکہ سنہ ہجری کے مطابق اس وقت ان کی عمر چوراسی سال سے صرف تیرہ دن کم اور سال عیسوی کے بموجب اکیاسی برس ۵ ماہ اٹھارہ دن تھی۔

(۵) قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی۔ غالب سے اصلاح کلام کا سلسلہ صفر ۱۲۶۹ھ (دسمبر ۱۸۵۲ء) میں شروع ہوا۔ اس مہینے میں غالب کو خواہش حک و اصلاح پر مشتمل ان کا "نامۂ مہر پیوند ...... باغزلے چند" موصول ہوا جس کا جواب الفضول نے شنبہ ۲۸ صفر ۱۲۶۹ (۱۱ دسمبر ۱۸۵۲ء) کو ان الفاظ میں دیا:

"چندانکہ دیدہ بداں سواد دوختم، نا دیبا صورتے بنظر درنامد ..... می باید حلقہ بر دل زد وہمت از مبداء فیاض در یوزہ کرد بکثرت مشق و فراوانی ورزش و پیروی راہ روان راہ دان کشایش ہا رسے خواہد نمود و اندیشہ را دستگاہ و گفتار را سرمایہ خواہد افزود ...... ۳۵"

اگلے ایڈیشن میں اس خط کے حوالے سے آغاز اصلاح کے زمانے کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔

(۶) مولانا الطاف حسین حالی:۔ غالب سے استفادے کے ثبوت کے طور پر یہ شعر بھی پیش کیا گیا ہے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

یہ شعر عام طور پر اس طرح نقل کیا جاتا ہے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں
غالب کا معتقد ہوں، مقلد ہوں میر کا

پہلی روایت میں میر کے مقابل میرزا کے ذکر سے ذہن غالب کی بجائے سودا کی طرف منتقل ہوتا ہے، اس لیے جب تک کسی شخص کو دوسرے ذرائع سے یہ علم نہ ہو کہ حالی مرزا غالب کے شاگرد تھے وہ صرف اس شعر کی روشنی میں اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ دوسری روایت غالب سے محض اعتقاد اور شیفتہ سے باقاعدہ استفادے یعنی اصلاح کلام پر دلالت کرتی ہے حالانکہ مؤخرالذکر اس

بالیقین خلافِ واقعہ ہے چونکہ یہ شعر دیوان حالی میں موجود نہیں، اس لیے اس قسم کے شبہات کو سرسری طور پر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ آیندہ اشاعت میں اسے شامل کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا مناسب ہوگا کہ اسے سب سے پہلے کس نے اور کہاں نقل کیا ہے اور اس کا صحیح متن کیا ہے؟

(۷) حسین، خورشید صاحب دہلوی:۔ فاضل مصنّف کا ارشاد ہے کہ یہ دہلی کے باشندے تھے اور تالیف "یادگارِ ضیغم" کے زمانے میں کلکتہ میں مقیم تھے" (ص ۹۴) یہ صاحب نہیں، صاحبہ اور بہ اعتبار پیشہ طوائف تھیں، پورا نام بی خورشید جان تھا گلدستہ "نتیجۂ سخن" کلکتہ کے ۱۸۸۴ء اور ۱۸۸۵ء کے متعدد شماروں میں "بی خورشید جان طوائف دہلوی مقیم کلکتہ متخلص بہ حسینؔ خوشہ چینِ خرمنِ حضرت غالبؔ" کے زیرِ عنوان ان کی طرحی غزلیں موجود ہیں۔ لیکن ۱۸۸۳ء کے شماروں میں کسی کی شاگردی کا ذکر نہیں اور جنوری ۱۸۸۶ء کے شمارے میں ان کے نام کے ساتھ "شاگردِ طبیعتِ خود" لکھا ہوا ہے۔ ان اندراجات کے برخلاف "دیوان حسینؔ" کے خاتمے میں یہ بتایا گیا ہے کہ موصوفہ حکیم شیخ بنو صاحب متخلص بہ ہلال بنارسی شاگرد حضرت شوخیؔ کے خرمنِ فیض کی خوشہ چین تھیں" (ص ۱۳۵) یہ دیوان رپن پریس کلکتہ سے ۱۳۰۳ھ (۸۶-۱۸۸۵ء) میں شائع ہوا۔

(۸) مرزا محمد اکبر خاں خاورؔ:۔ "تلامذۂ غالب" کے مطابق خاورؔ کی پیدائش ۱۸۴۲ء (۱۲۵۵ھ) میں اور وفات ۱۸۸۱ء (۱۲۹۸ھ) میں ہوئی (ص ۹۸-۹۹) سالِ وفات کی تائید میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ رخشاں کی یہ تاریخی رباعی نقل کی گئی ہے ؎

صد حیف کہ مرد خاورِ دانش ور | آں شاعرِ خوش بیانِ معنی پرور
یک سال دگر کاش بماندے زندہ | تا سال شدے کہ "مرد مرزا خاور"

۱- ۱۲۹۹ = ۱۲۹۸ھ

اولاً ۱۸۴۲ء اور ۱۲۵۵ھ کی باہم مطابقت درست نہیں کیونکہ ۱۸۴۲ء

۱۸ ذی قعدہ ۱۲۵۷ھ کو شروع ہوکر ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ کو ختم ہوا تھا۔ ثانیاً سنۂ ہجری پر سنہ عیسوی کی تقدیم بھی اصولی طور پر غلط ہے۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ معلوم سنہ کو نامعلوم سنہ پر مقدم رکھا جائے۔ ان امور سے قطع نظر لالہ سری رام کی تحریر کے بموجب ۱۲۹۵ھ میں نادر کا سن پینتالیس برس کا تھا اور انھوں نے ساٹھ برس سے زیادہ عمر پاکر انتقال کیا۔ اس اعتبار سے ان کا سال ولادت ۱۲۵۰ھ (۳۵-۱۸۳۴ء) اور زمانہ وفات ۱۳۱۰ھ (۹۳-۱۸۹۲ء) کے بعد قرار پاتا ہے۔ ایک خاص سنہ میں سن عمر کے تعین کی بنا پر لالہ سری رام کی پہلی اطلاع کسی مستند ماخذ پر مبنی معلوم ہوتی ہے اس لیے کسی معتبر شہادت یا قوی دلیل کے بغیر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن وفات کے وقت اندازۂ عمر کے متعلق ان کا دوسرا بیان خیر (متوفی ۱۳ رمضان ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۷ جون ۱۸۸۵ء) کے مستخرجہ مادہ تاریخ سے حاصل شدہ سنہ کی روشنی میں ناقابل قبول ہے۔

(۹) دیوان جانی بہاری لال جی راضیؔ:۔ فاضل مصنف تحریر فرماتے ہیں کہ "زندگی مدرسی سے شروع کی اور اسی سلسلے میں اعظم گڈھ اور بنارس میں قیام رہا۔ اس کے بعد فوج انگریزی کے پڑھانے کا پیشہ اختیار کیا۔ اور سات برس تک پلٹنوں کے ساتھ شمالی ہند کے اکثر شہروں کا چکر کاٹ کے محکمے کی سفارش پر اول مہاراجہ سجن سنگھ رانا میواڑ کے اتالیق اور بعد میں راجہ جسونت سنگھ کے زمانے میں ریاست بھرت پور میں راجپوتانہ ریذیڈنسی کے وکیل رہے۔" (ص ۱۱۱) اس کے برخلاف لالہ سری رام کا بیان ہے کہ

"آٹھ برس بنارس میں قیام رہا۔ وہاں سے ۱۸۴۶ء میں پلٹن نمبر ۶۲ میں میر منشی ہو کر سات برس تک ڈھاکا، کلکتہ، الٰہ آباد اور اٹاوہ میں رہے۔ بعد میں ریاست بھرت پور میں ریزیڈنسی راجپوتانہ کے وکیل مقرر ہوئے پھر مہاراجہ سجن سنگھ بہادر والی میواڑ کے کئی برس اتالیق رہے۔"[۵۳]

مالک رام صاحب نے "خم خانۂ جاوید" سے استفادہ کیا ہے لیکن انھوں نے فوج

میں ملازمت کے آغاز کا سنہ معلوم ہونے کے باوجود اسے اہمیت نہیں دی۔ سوانحی نقطۂ نظر سے یہ طریق کار نامناسب ہے اس کے علاوہ ڈھاکہ اور کلکتہ میں ملازمت کے متعلق شہادت کی موجودگی میں یہ کہنا کہ "سات برس تک ..... شمالی ہند کے اکثر شہروں کے چکر کاٹا کیے" درست نہیں۔ اسی طرح یہ بیانات بھی کہ راقم پہلے مہاراجہ سجن سنگھ والئ میواڑ کے اتالیق اور اس کے بعد بھرت پور میں راجپوتانہ رزیڈنسی کے وکیل رہے ترمیم طلب ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ لالہ سری رام کی تحریر کے مطابق وہ فوج کی سات سالہ ملازمت کے بعد پہلے ریاست بھرت پور میں وکیل اور اس کے بعد رانا میواڑ کے اتالیق مقرر ہوئے تھے۔

(۱۰) شیخ عبدالحمید رسوا غازی پوری :- محترم مصنف کا ارشاد ہے کہ رسوا ۱۸۴۹ء میں غازی پور میں پیدا ہوئے تھے (ص ۷۷) یہ اطلاع مشاعرہ آگرہ کے گلدستے "شعر و سخن" پر مبنی ہے اس لیے یہاں بھی قطعیت کی وہی صورت ہے جس کی طرف تپش اکبر آبادی کے ذکر میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ محتاط الفاظ میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ رسوا ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) کے قریب پیدا ہوئے تھے۔ ضمناً یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ لالہ سری رام نے ان کا سال ولادت ۱۸۴۱ء تحریر کیا ہے جو یقیناً غلط ہے۔

(۱۱) قاضی محمد عنایت حسین رشکی بدایونی :- "تلامذۂ غالب" کے مطابق رشکی ۱۸ / مارچ ۱۸۳۲ء (۱۵ شوال ۱۲۴۷ھ) کو پیدا ہوئے تھے۔ سرکار انگریزی میں کچھ مدت سررشتہ دار عدالت رہنے کے بعد نواب محمد علی خاں رئیس ٹونک کی مصاحبت اختیار کی اور "جب وہ معزول ہو گئے تو انھوں نے بھی حق رفاقت ادا کیا"۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۸ء (۷ صفر ۱۳۳۷ھ) کو بدایوں میں انتقال ہوا۔ (ص ۱۲۰، ۱۲۱)۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ تاریخ ولادت ۱۵ شوال ۱۲۴۷ھ (۱۸ یا ۱۹ مارچ ۱۸۳۲ء) لکھی جائے۔ ایک معاصر شہادت کے مطابق یکم شوال ۱۲۴۷ھ دو شنبہ ۵ مارچ ۱۸۳۲ء کے مطابق تھی؟ اس لیے ۱۸ کی بجائے ۱۹ مارچ زیادہ صحیح تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ نواب محمد علی خاں کے ذکر میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ وہ کب معزول ہوئے اور معزولی کے بعد کہاں رہے بیان

کو زیادہ واضح کرنے اور سوانحی انداز دینے کے لیے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ متعلقہ حصّۂ احوال کو اس طرح لکھا جائے۔

"..... پھر نواب محمد علی خاں والیٔ ٹونک (زمانۂ جلوس جنوری ۱۸۶۵ء) کی مصاحبت اختیار کی اور جب دسمبر ۱۸۶۷ء میں وہ معزول ہو کر بنارس میں نظر بند ہوئے تو بھی حقِ رفاقت ادا کیا۔ ان کی وفات (۱۶ صفر ۱۳۱۳ھ مطابق ۸ اگست ۱۸۹۵ء) کے بعد وکالت کرنے لگے۔"

رشکی کی صحیح تاریخ وفات ۶ صفر ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۱۸ء ہے[۵۶]۔ تقویم کی رو سے ۱۲ نومبر ۹ صفر کے اور ۶ صفر ۱۱ نومبر کے مطابق ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک ایک معاصر شہادت کے حوالے سے پیش کردہ متذکرہ بالا تاریخ کی موجودگی میں تطبیق کے اس فرق کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔

جناب نثار احمد فاروقی نے اپنے مضمون میں شعرائے بدایوں کے ایک "ناقص (الطرفین) تذکرے" کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ پہلے اشکی (الف کے ساتھ) تخلص کرتے تھے بعد میں فراق اختیار کیا[۵۷]" فاروقی صاحب کے بقول محولۂ بالا تذکرہ شاہ دلدار علی مذاق کے تلامذہ کے ذکر پر مشتمل ہے۔ بدایوں میں اس قسم کے دو تذکرے لکھے گئے ہیں۔ ایک "بہار بوستانِ شعراء" کے نام سے مولوی فضل اکرم بدایونی نے اور دوسرا "مذاقِ سخن" کے نام سے مولوی عبدالحیٔ صفا بدایونی نے لکھا تھا۔ ان دونوں تذکروں کا سالِ ترتیب ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) ہے اور یہ دونوں ہی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں مطبع صبح بدایوں سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ چونکہ فاروقی صاحب کے پیشِ نظر تذکرے میں شاعر موصوف کا ذکر فراق تخلص کے تحت کیا گیا ہے، ردیف الف کے ذیل میں اشکی تخلص کے ساتھ نہیں، اس لیے اشکی (بالالف) اور رشکی (بالرا) کے فرق کو سہوِ کتابت قرار دے کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ "تجلیاتِ سخن" میں بھی ان کا ذکر "ردیف را" کے تحت ہی کیا گیا ہے۔

(۱۲) نواب سید محمد زکریا خاں زکی :- فاضل مصنف کے بقول ان کا دیوان

غزلیات (دیوان زکی) ان کی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا" (ص ۱۳۸) یہ دیوان زکی کی وفات سے نو برس قبل ۱۳۱۲ھ (۹۵-۱۸۹۴ء) میں چھپا تھا۔

(۱۳) مرزا قربان علی بیگ سالک :۔ مصنف محترم کا ارشاد ہے کہ سالک نے "۵۷ برس کی عمر میں ۱۸۸۰ء (۱۲۹۷ھ) میں حیدرآباد میں وفات پائی۔" (ص ۱۴۱) اس کے برخلاف لالہ سری رام کا بیان ہے کہ "جناب سالک نے آخر ۱۸۷۹ء میں بمقام حیدرآباد دکن اس جہان فانی سے رحلت کی[۵۹]" قدر بلگرامی کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "نواب قربان علی سالک ہزار افسوس مرد" کی رو سے اصل سالِ وفات ۱۲۹۷ھ ہے جواز روئے تقویم ۱۵ دسمبر ۱۸۷۹ء کو شروع ہو کر ۳ دسمبر ۱۸۸۰ء کو ختم ہوتا ہے، اس لیے ۱۸۸۱ء کو سال وفات قرار دینا صریحًا غلط ہے لالہ سری رام کے بیان کی روشنی میں اصولاً یہاں سال رحلت ۱۲۹۷ھ (۱۸۷۹ء) لکھنا چاہیے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ سالک نے ۱۲۹۷ھ میں ۱۷ محرم سے قبل (۱۵ سے ۳۱ دسمبر ۱۸۷۹ء کے درمیان) انتقال کیا۔"

(۱۴) چودھری عبدالغفور سرور :۔ مالک رام صاحب لکھتے ہیں کہ ان کا کلام نہیں ملتا۔ حسن اتفاق سے ان کے چند قطعات محفوظ رہ گئے ہیں جو انھوں نے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی تقریب پر لکھے تھے اس کے علاوہ ایک قصیدۂ نعتیہ ملا ہے۔" (ص ۱۵۱) یہ کلام ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے دریافت کر کے ماہنامہ "آج کل" کے فروری ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شائع کرایا تھا۔

"غالب اور سرور" (مطبوعہ ۱۹۷۵ء) کے مصنف ایم حبیب خاں کے نزدیک بھی "ان قطعات اور نعتیہ قصیدے کے علاوہ سرور کا کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کلام موجود نہیں"[۶۰] چنانچہ انھوں نے بھی یہی قصیدہ اور دس قطعات تاریخ جن میں سے آٹھ فارسی میں اور باقی دو اردو میں ہیں، اپنی کتاب میں نقل کر دیے ہیں لیکن متذکرہ نعتیہ قصیدہ فی الحقیقت سرور کا طبع زاد نہیں، اس کے مصنف غالب ہی کے ایک دوسرے مارہروی شاگرد چودھری عطا حسین

علماء ہیں جن کا تخلص اس کے ستائیسویں شعر میں جو نیچے نقل کیا جا رہا ہے موجود ہے ؎

بخت خفتہ کو ترے کون جگاتا ہے عطا
ہاں مگر وہ شہ ابرار شفیع امت

آرزو صاحب کے دریافت کردہ متذکرہ بالا قطعات تاریخ کے علاوہ سرور کے مختلف الاصناف کلام کے سب سے زیادہ نمونے مرزا حاتم علی بیگ مہر کی دو تصانیف "شبیہ عشرت" (مطبوعہ ستمبر ۱۸۷۱ء) اور "نعمت المسرت" (مطبوعہ ۱۸۷۴ء) میں محفوظ ہیں۔ "شبیہ عشرت" میں شامل کلام کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) دو قطعات تاریخ۔ فارسی (۷ + ۲ = ۹ شعر)

(۲) فرد تاریخی۔ فارسی (۱ شعر)

(۳) ایک "غزل سہرہ" اردو (۶ شعر)

(۴) مثنوی تاریخی در تہنیت ولادت فرزند۔ فارسی (۸ شعر)

"نعمت المسرت" میں موجود کلام بہ تفصیل ذیل اڑتالیس اشعار پر مشتمل ہے:۔

(۱) قطعہ در مدح آغا سخاوت علی بیگ عرف بیگما۔ فارسی (۱۹ شعر)

(۲) غزل مبارک باد تبقریب ختنہ و مکتب۔ اردو (۷ شعر)

(۳) قطعۂ تاریخ تبقریب مکتب لنگیمنی۔ فارسی (۱۱ شعر)

(۴) شادی مکتب سے متعلق نثر کے ساتھ شامل دو اردو اشعار۔

"غزل سہرہ" تبقریب شادی مرزا سخاوت علی بیگ ضیا فرزند مہر کے مقطعے میں سرور نے بہ ایں الفاظ غالب کے تتبع کا اعتراف کیا ہے ؎

ہاں تتبع ہیں یہ غالب کے سب اشعار سرور
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

سرور کی تاریخ وفات نامعلوم ہے۔ حبیب خاں نے اپنی کتاب "غالب اور سرور" میں ان کے بھانجے اور پسر متبنٰی چودھری عبدالصبور کا ایک قطعہ تاریخ نقل کیا ہے لیکن اس سے سال رحلت کے استخراج کی کوئی صورت نظر نہیں،

آتی۔ "نعت المسرت" میں شامل کلام کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں اس رسالے کی ترتیب و طباعت کے وقت تک بقیدِ حیات تھے۔

(۱۵) حبیب الدین احمد سوزاں سہارن پوری :۔ محترم مصنف فرماتے ہیں کہ ان کا ایک مختصر دیوان ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا" (ص ۱۵۳) یہ دیوان سوزاں کی وفات (۱۸۸۹ء) سے چھ سات برس قبل ۱۳۰۰ھ (۸۳-۱۸۸۲ء) میں مطبع انصاری دہلی میں چھپا تھا۔

(۱۶) سید محمد عبدالرزاق شاکر مچھلی شہری :۔ شاکر کے بارے میں ایک مفصل مضمون بعنوان "مولانا سید محمد عبدالرزاق شاکر مخاطب" (نوشتہ یکے از نامہ نگاران اردوے معلّٰی) ماہنامہ "اردوے معلّٰی" کے دسمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ مالک رام صاحب نے اس سے استفادہ فرمایا ہے لیکن اس کے بعض اہم اندراجات کو نظر انداز کر دیا ہے مثلاً انھوں نے شاکر کے زمانۂ ولادت کا ذکر نہیں کیا جب کہ اس مضمون کے مطابق وہ ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ (مارچ ۱۸۳۵ء) میں پیدا ہوئے تھے وکالت کے پیشے اور سرکاری ملازمت سے وابستگی کے سلسلے میں مالک رام صاحب کا بیان ہے کہ "ابتدا میں وکالت کا امتحان دیا اور اس میں کامیابی کے بعد وکالت شروع کی ...... پھر ۱۸۷۳ء میں سرکاری ملازمت قبول کر کے منصف بن گئے ..... دورانِ ملازمت میں بہت دن تک الٰہ آباد میں قیام رہا.. ۱۸۹۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی ....."

تذکرہ بالا مضمون کی روشنی میں اس حصہ احوال کو اس طرح لکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔

"۱۸۶۳ء میں وکالت ہائی کورٹ کا امتحان دیا اس میں کامیابی کے بعد گورکھپور میں وکالت شروع کی ..... ۱۸۷۱ء میں گورکھپور سے ترک سکونت کر کے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس کا آغاز کیا۔ پھر

مرزا ہرگوپال تفتہ کی وفات کے قطعہ تاریخ اور اس کے عنوان دونوں میں موخرالذکر تخلص کا اندراج ملتا ہے۔ یہ قطعہ فارسی میں ہے اور شوخی کے فارسی کلام کا کوئی نمونہ "تلامذہ غالب" میں موجود نہیں، اس لیے سطور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے ؎

تفتہ شاعر زیبا حیف رفت از دنیا
سال انتقالش را فکرِ شوخ طالب بود
خوب منکشف شد راز باب تعمیہ شد باز
آمد از فلک "آواز" یادگار غالب بود

۱۵ + ۱۲۸۱ = ۱۲۹۶ھ

(۲۰) مولوی محمد عزیز الدین صادق بدایونی۔ آپ کی تاریخ ولادت مذکور نہیں اور تاریخ وفات ۲۵ نومبر ۱۸۹۲ء (۱۶ جمادی الاول ۱۳۱۱ھ) بتائی گئی ہے آپ کے حقیقی بھتیجے خان بہادر مولوی رضی الدین بسمل بدایونی کی تحریر کے مطابق آپ ۱۷ صفر ۱۲۴۴ھ (۲۹ اگست ۱۸۲۸ء) کو پیدا ہوئے تھے اور ۲۶ جمادی الآخر ۱۳۱۱ھ (۴ جنوری ۱۸۹۴ء) کو فوت ہوئے[۵۲] "تجلیات سخن" میں تاریخ انتقال ۱۶ جمادی الآخر ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء درج ہے[۵۳]

صادق کے بڑے بھائی محمد سعید الدین کامل کو مالک رام صاحب نے ان کا چھوٹا بھائی بتایا ہے کامل، صادق سے دو سال پانچ ماہ قبل ماہ رمضان المبارک ۱۲۴۱ھ کی اکیسویں تاریخ (۲۹ اپریل ۱۸۲۶ء) کو پیدا ہوئے تھے۔ اور ان کی وفات کے پانچ برس ایک ماہ بعد ۲۷ رجب ۱۳۱۶ھ (۱۱ دسمبر ۱۸۹۸ء) کو فوت ہوگئے انہیں ادب و شعر کے علاوہ علم طب میں بھی کمال حاصل تھا۔

صادق ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے قبل دہلی میں وکالت کرتے تھے اس ہنگامے کے فرو ہونے کے بعد ۱۸۵۹ء میں شاہجہانپور میں پریکٹس شروع کی،[۵۴] لیکن کچھ دنوں کے بعد پھر دہلی کو دوبارہ اپنا مستقر بنالیا۔ چنانچہ "قاطع برہان" کے قضیے کے سلسلے میں مولوی امین الدین مصنف قاطع القاطع کے خلاف ازالہ حیثیت

عرفی کے مقدمے میں غالب کی طرف سے انھوں نے ہی پیروی کی تھی۔ یہ مقدمہ ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو دائر کیا گیا تھا۔ دہلی میں صادق کا آبائی مکان محلہ لال کنواں میں تھا۔ اس محلے کی "گلی عزیز الدین وکیل" انھی کے نام سے منسوب ہے۔ "تلامذۂ غالب" کے آئندہ ایڈیشن میں واقعات اور زمانۂ واقعات کی تصحیح کے پہلو بہ پہلو ازالۂ حیثیت کے مقدمے میں غالب کی طرف سے پیروی کے واقعے اور ان سے منسوب گلی کے ذکر کا اضافہ مناسب ہوگا۔

(۲۱) سید شیر محمد خاں طالب دہلوی:۔ "تلامذۂ غالب" میں ان کا تعارف ان الفاظ پر مشتمل ہے کہ "غالب کے علاوہ حافظ عبدالرحمٰن احسان سے بھی اصلاح لی" (ص ۲۰۱) لالہ سری رام نے "سید شیر محمد تلمیذ حضرت غالب دہلوی" اور "منشی شیر محمد خاں دہلوی شاگرد عبدالرحمٰن خاں احسان" کا ذکر دو مختلف شاعروں کی حیثیت سے کیا ہے[1] ان کی اطلاع کے مطابق موخر الذکر صرف تینتالیس سال کی عمر میں فوت ہو چکے تھے۔ ان کے انتخاب کلام میں کل تین شعر نقل کیے گئے ہیں جو "سمجھایا نہ جائے گا، بجھایا نہ جائے گا" کے قوافی و ردیف میں ہیں۔ اس غزل کا مطلع "تلامذۂ غالب" میں منقول ہے۔ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں اس طرح پر دہلی میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد ہوا تھا[2] جس میں غالب کے کئی شاگردوں نے شرکت کی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ غزل اسی موقع پر کہی گئی ہو۔ بہر صورت یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ لالہ سری رام کی تحریر کے مطابق فی الواقع یہ دو مختلف شاعر ہیں یا انھوں نے محض اختلاف تلمذ کی بنا پر شخص واحد کا ذکر دو مختلف اشخاص کی حیثیت سے کیا ہے۔

(۲۲) سید محمد سلطان عاقل دہلوی:۔ صاحب تلامذہ کے مطابق "عاقل ۱۳ مئی ۱۸۵۴ء (شعبان ۱۲۷۰ھ) کو پیدا ہوئے" (ص ۲۲۸) اور "طاعون کا شکار ہونے کے بعد انھوں نے صرف ۳۹ برس کی عمر میں ۱۴ اگست ۱۸۹۱ء (۸ محرم ۱۳۰۹ھ) کو داعی اجل کو لبیک کہا" (ص ۲۲۹) ۱۳ مئی ۱۸۵۴ء سے ۱۴ اگست ۱۸۹۱ء تک کل سینتیس (۳۷) سال تین ماہ کی مدت ہوتی ہے۔ اسے انتالیس سال

قرار دینا غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے حسبِ معمول یہاں بھی تاریخِ ہجری کو تاریخِ عیسوی سے بدل کر باقی حالات و واقعات کو بعینہٖ اپنے ماخذ کے مطابق نقل کر دیا ہے اس سلسلے میں ان کی معلومات "خم خانۂ جاوید" پر مبنی ہے جس کے بموجب عاقل "۵ اشعبان ۱۲۷۰ھ کو پیدا ہوئے" اور انھوں نے "۳۹ سال کی عمر میں ۸ محرم ۱۳۰۹ھ کو رحلت کی تھی" مالک رام صاحب کو ان اطلاعات کے نقل کرنے میں سنہ عیسوی پر سنہ ہجری کی تقدیم برقرار رکھنا چاہیے تھی۔ بصورتِ دیگر سنینِ عمر کا بھی از سرِ نو حساب کرنا ضروری تھا۔

(۲۴) حکیم سید احمد حسن فنا (اصلاً فدا) سہسوانی:۔ فاضل مصنف کا ارشاد ہے کہ حکیم صاحب موصوف "نواب ابراہیم علی خاں وفا کے عزیزوں میں تھے۔ ان کے والد القاضی سید حسن صالحی تھے...... ۱۸۹۲ء (۱۳۱۰ھ) میں بعمر ۶۵ سال انتقال کیا۔" (ص ۲۴۶، ۲۴۷) "خزینۃ الانساب" اور "حیوۃ العلماء" کے مطابق فدا کے والد کا نام سید محمد حسن تھا[۱۹]۔ میر ابراہیم علی خاں وفا سے ہم خاندان ہونے کے علاوہ ان کی صرف اتنی رشتہ داری تھی کہ وفا کے دادا میر سرفراز علی کی زوجۂ ثانی مسماۃ وزیر النساء ان کے والد کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ سنینِ عمر اور سال وفات (۱۳۱۰ھ) کے اصل راوی صاحب "حیوۃ العلماء" مولوی عبدالباقی سہسوانی ہیں جو فدا کی حقیقی چچا زاد بہن کے صاحبزادے تھے، اس لیے ان کے بیان کو معتبر مانتے ہوئے سال ولادت تخمیناً ۱۲۴۵ھ (۳۰-۱۸۲۹ء) متعین کیا جا سکتا ہے۔

فدا کا دیوان "تلامذۂ غالب" کی اشاعت کے تقریباً بائیس برس بعد یعنی ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا مقدمہ مالک رام صاحب ہی نے تحریر فرمایا ہے۔ اس مقدمے میں موصوف نے فدا کے قیامِ دہلی اور تحصیلِ علم کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "دلی سے وطن واپس چلے جانے کے بعد ان کی استاد سے خط و کتابت رہی (چنانچہ) ان کے نام چند خطوط "اردوئے معلّٰی" میں شامل ہیں۔

ــــ ان کے خاندان کے بعض اصحاب کا تعلق ریاست بڑودہ سے تھا۔ انھیں کی ترغیب پر فدا نے بھی بڑودہ کی راہ لی[20] ہے فدا سید احمد حسن عرشی کی وساطت سے ستمبر ۱۸۶۰ء میں غالب کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے تھے[21] اس وقت فدا اور عرشی (متوفی ۲۳ رنومبر ۱۸۶۰ء) دونوں ہی بڑودے میں مقیم تھے بلکہ ایک روایت کے بموجب موخر الذکر اول الذکر کے مہمان تھے[22] اس لیے یہ کہنا کہ وطن (سہسوان) جانے کے بعد استاد سے ان کی خط و کتابت ہوتی رہی، درست نہیں۔ "اردوے معلّی" میں فدا کے نام جتنے خطوط ہیں وہ سب ستمبر ۱۸۶۰ء کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اور اس زمانے میں وہ وطن سے ترک سکونت کے بعد مستقلاً بڑودے میں قیام پذیر تھے۔ اسی طرح یہ بیان بھی خلاف واقعہ ہے کہ فدا نے خاندان کے بعض اصحاب کی ترغیب پر بڑودے کی راہ لی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی والدہ امیر النساء خود بڑودے کی رہنے والی تھیں۔ وہ سید باسط علی کی صاحبزادی تھیں جو سادات بارہہ میں سے تھے[23]۔

"دیوان فدا" کے ایک دوسرے مقدمہ نگار ڈاکٹر سید وحید اشرف کا بیان ہے کہ "فدا اپنے وطن سہسوان سے آکر پہلے سورت میں مقیم ہوئے تھے اور غالباً یہیں ان سے غالب کی ملاقات ہوئی تھی[24]" اسی مقدمے میں آگے چل کر موصوف نے فدا کے پرپوتے سید واجد حسین کی وساطت سے بڑودے کے ایک شاعر جمیل الدین کا بیان کردہ یہ روایت نقل کی ہے کہ "فدا کی ملاقات غالب سے سورت میں ہوئی اور سورت ہی میں انھیں غالب سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا[25]" فدا کے وطن (سہسوان) سے ترک سکونت کے بعد بڑودے سے قبل سورت میں قیام کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم موجودہ معلومات کے مطابق یہ روایت حد درجہ مشکوک ہے لیکن غالب کے سفرِ سورت کی روایت صریحاً خلاف واقعہ ہے[26]

(۹۳) میر غلام حسنین قدر بلگرامی :۔ صاحب تلامذہ کا ارشاد گرامی ہے کہ قدر

۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں پیدا ہوئے ..... پہلے ہردوئی میں مدرس رہے پھر وہاں سے

تبدیل ہو کر کیننگ کالج لکھنؤ میں فارسی اور عربی کے استاد مقرر ہوگئے..... بروز شنبہ ۱۴ ستمبر ۱۸۸۴ء (۲۳ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ) کی سہ پہر کو (لکھنؤ میں) رہ گرائے عالم جاودانی ہوگئے۔" (ص ۲۴۸، ۲۴۹) وصل بلگرامی کے بقول قدر کی ولادت ماہ جمادی الآخر ۱۲۴۹ھ (اکتوبر، نومبر ۱۸۳۳ء) میں ہوئی تھی۔ وہ ہردوئی سے لکھنؤ تبادلے پر نہیں آئے تھے۔ یہ بالکل نئی ملازمت تھی جو انھیں غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ کی وساطت سے حاصل ہوئی تھی۔ قدر دسمبر ۱۸۸۳ء تک کل سات برس چھ مہینے اس عہدے پر برقرار رہے گویا لکھنؤ میں ان کا یہ تقرر جولائی ۱۸۷۶ء میں ہوا تھا۔ "تلامذۂ غالب" میں درج مذکرۂ بالا تاریخ وفات صحیح ہے لیکن اس تاریخ کو شنبہ نہیں یکشنبہ تھا۔ مدفن میر خدا بخش کی کربلا میں ہے جس کی لوح پر منشی محمد احمد کا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے:

روز یکشنبہ بدو بست وسوم ذی قعدہ را
بردو پہر روز سہ ساعت چہ نازیبا بشد
آوخ از واژونیٔ چرخ دز آہنگ شد
کان علم از دہر یعنی اوستاد ما بشد
بہر رقم سال وفاتش احمد صوری معنوی

دربزار وسہ صد و یک قدر از دنیا بشد

کلیات قدر کے دیباچے میں سید ابن علی بلگرامی نے بھی تفصیلات (؟) الفاظ میں بیان کی ہیں:

باون برس کی عمر میں بست وسوم ماہ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ مطابق چہار دہم ماہ ستمبر ۱۸۸۴ء روز یکشنبہ شہر لکھنؤ میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی اور وہیں میر خدا بخش کی کربلا میں مدفون ہوئے۔

قدر کی تصانیف کے ذکر میں ان کے "چند درسی رسالوں" میں سے بعض کے نام "شرح مجموعۂ سخن، شرح قصائد عرفی، نظم الارکان، ابیات گلستاں" بتائے گئے ہیں (ص ۲۴۹) اول الذکر رسالہ کا نام "عطر مجموعہ" اور دوسرے کا "رسم عرفی" ہے۔

"نظم الارکان" اور "ابیات گلستان" دو مختلف رسالے نہیں۔ یہ ایک ہی رسالہ ہے جس کا پورا نام "نظم الارکان فی تقطیع ابیات گلستان" ہے۔ "نظم الارکان" تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) برآمد ہوتا ہے۔

(۲۵) منشی تفضل حسین کوکب:۔ مالک رام صاحب نے فرمایا ہے کہ "ان کے حالات نہیں ملے" مرزا قربان علی بیگ سالک کے ایک قطعۂ تاریخ کی رو سے ان کا تاریخی نام "آغا مرزا" تھا۔ ۱۲۹۰ھ (۷۴-۱۸۷۳ء) میں انتقال کیا۔ قطعۂ درج ذیل ہے

چوں تفضل حسین خاں افسوس	دہر ناپائیدار را بگذاشت
"آغا مرزا" کہ نام تاریخی ۱۲۵۰	بہر سالِ ظہورِ خود می داشت
ہم بسالِ وفاتِ او آں را	کلکِ سالک سرِ مزار نگاشت

۱۲۵۰+۴۰=۱۲۹۰ھ

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے نام غالب کے ایک خط سے جو بگمان غالب ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فارسی کلام کا ایک مجموعہ کوکب کے پاس بھی تھا۔

(۲۶) میر عالم علی مائل سہسوانی:۔ "تلامذۂ غالب" کے مطابق مائل نے "عین جوانی میں انتقال کیا" (ص ۲۵۲) مولانا سید اعجاز احمد منجز سہسوانی کے بقول انھوں نے "عالم جوانی میں بعمر ۳۲ سال ۱۲۸۵ھ میں رحلت کی تھی" اس کے برخلاف ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی کا بیان ہے کہ "مائل نے ۱۲۹۰ھ کے آس پاس انتقال کیا۔" ان بیانات میں سے منجز کا بیان اس لیے ناقابل قبول ہے کہ مطبع نول کشور سے ذی قعدہ ۱۲۸۷ھ مطابق جنوری ۱۸۷۱ء میں شائع شدہ دو کتابوں "چمنستانِ جوش" (دیوان نواب احمد حسن خاں جوش) اور مثنوی "سعدین" (مصنف منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی) کے آخر میں ان کے قطعاتِ تاریخ موجود ہیں۔ مدنی صاحب کے بیان کی بھی تقریباً یہی کیفیت ہے، مرزا قربان علی بیگ سالک کا ایک قطعہ تاریخ واضح طور پر اس کی تردید کرتا ہے۔ سالک کے دیوان میں کئی ایسے قطعاتِ تاریخ موجود

ہیں جو بڑودہ میں مقیم رؤسائے سہسوان سے ان کے مخلصانہ و نیازمندروابط اور بعض تقریبات کے سلسلے میں سفر بڑودہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انھی قطعات میں "قطعۂ تاریخ افتادن جام مملو کہ میر عالم علی" کے زیر عنوان مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ بھی شامل ہے ؎

تھا یہ وہ جام جس کی خوبی پر — جامِ گیتی نما فدا افسوس
وہ طلاکار، آبِ زر جس کا — زر پہ دینے سے بنا افسوس
وہ بلور اس کا تھا کہ جس کو مہر — ہو کے حیران دیکھتا افسوس
میر عالم علی کی ملک سے تھا — غم میں عالم ہے مبتلا افسوس
اک ملازم کے ہاتھ سے ناگاہ — فرشِ سنگیں پہ گر پڑا افسوس
آبِ شیریں میں آگئی تلخی — اب ہے پینے میں کیا مزا افسوس
سال سالک نے یہ بدیہہ کہا — بال ساغر میں آگیا افسوس

اس قطعے کا مصرع آخر ۱۲۹۴ھ پر مشتمل ہے۔ یہ سنہ "ساغر" کے اعداد (۱۲۶۱) میں لفظ "بال" کے عدد (۳۳) جوڑ کر حاصل کیا گیا ہے۔ اس واضح شہادت کے مطابق مائل ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) تک بقید حیات تھے۔ لیکن ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں "طور کلیم" (مرتبہ نور الحسن خاں کلیم) اور "بزم سخن" (مرتبہ علی حسن خاں سلیم) کی تالیف و تکمیل سے قبل ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ میری نانی کی بڑی بہن جنھوں نے پچاسی سال سے زیادہ عمر پاکر اکتوبر ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا، بیان کرتی تھیں کہ مائل سہسوان ہی میں گھوڑے کی پشت سے گر کر فوت ہوئے تھے۔

عدلی صاحب کا یہ بیان بھی محل نظر ہے کہ "مائل کے بیٹے خان بہادر میر مظہر علی ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے"۔ حقیقت یہ ہے کہ مائل نے کوئی اولاد اپنی یادگار نہیں چھوڑی۔ میر مظہر علی ان کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے جنھوں نے چوراسی سال کی عمر میں یکشنبہ ۱۱ شعبان ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۳۰ء کو انتقال کیا۔

غالب نے احمد حسن فدا کے نام کے ایک خط میں میر ابراہیم علی خاں وفا اور میر عالم علی خاں مائل کے باہمی رشتے اور ان دونوں سے فدا کی قرابت کے بارے میں

دریافت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آمگے اس راج میں حسام الدین حسین خاں بڑے معزز اور مکرم متوسل تھے اور بہر حاصل جاگیر میں رکھتے تھے کیا سید ابراہیم ابراگلی خاں صاحب اسی خاندان سے ہیں ؟ اور وہاں یہ بھی لکھیے کہ میر عالم علی خاں کو ان سے اور آپ کو ان دونوں صاحبوں سے کیا قرابت ہے ؟" [۳۲] غالباً اسی سوال کی بنیاد پر مالک رام صاحب نے مائل کے حالات میں میر ابراہیم علی خاں کو" ان کے عزیزوں میں لکھا ہے۔ مدنی صاحب اور مولانا غلام رسول مہر انھیں مجتبٰی وفا کا بھائی بتاتے ہیں [۳۴] لیکن نہ تو حسام الدین حسین کے خاندان سے نسبت کے سلسلے میں مرزا غالب کا قیاس صحیح تھا اور نہ وفا اور مائل کے باہمی رشتے کے متعلق آخر الذکر دونوں حضرات کا بیان درست ہے ۔ حسام الدین حسین خاں کے بزرگ ہرات کے رہنے والے تھے اور ان کا خاندان دہلی ہوتا ہوا بڑودہ پہنچا تھا جب کہ مائل اور وفا کے مورث اعلیٰ بخشی الاصل تھے اور یہ لوگ سہسوان (ضلع بدایوں) سے بڑودہ منتقل ہوئے تھے ۔ ان دونوں خاندانوں کے درمیان اس زمانے تک کوئی رشتہ داری بھی قائم نہیں ہوئی تھی ۔ بعد میں وفا کے دو بیٹوں سید احتشام علی اور سید محمود علی کی شادیاں حسام الدین حسین کے بیٹے سید لقد الدین حسین کی دو صاحبزادیوں سے اور ایک بیٹی سراج النساء کا نکاح موخر الذکر کے بیٹے سید نصیر الدین سے ہوا ۔ مائل کے چھوٹے بھائی خان بہادر میر منظر علی کے صاحبزادے خان بہادر میر اظہر علی کی پہلی شادی بھی حسام الدین حسین کے فرزند اکبر میر کمال الدین حسین کی صاحبزادی سے ہوئی تھی ۔ مائل اور وفا دونوں اگرچہ قاضی عبد الشکور (مورث اعلیٰ سادات سہسوان) کے فرزند اکبر قاضی محمد صالح کی اولاد میں تھے لیکن ان دونوں میں کوئی بہت قریبی رشتہ نہ تھا بجز اس کے کہ وفا کے دادا میر فراز علی کی دوسری شادی مائل کی حقیقی پھوپھی مسماۃ وزیر النساء (بنت سید عطار الدین) سے ہوئی تھی ۔ فدا اور وفا کے درمیان بھی قرابت کی تقریباً یہی نوعیت تھی ۔ اس کے برخلاف مائل اور فدا کے درمیان بہت قریبی اور دوہرا خونی رشتہ تھا ۔ مائل کی والدہ مسماۃ مہر النساء (بنت قاضی فضل امام) فدا کی حقیقی پھوپھی اور ان کی

دادی مسماۃ امیر النساء (زوجہ عطاء محی الدین) فدا کے والد (سید محمد حسن بن قاضی فضل امام) کی حقیقی پھوپھی تھیں۔

مائل کا کلام انتہائی کمیاب ہے۔ مالک رام صاحب نے ان کے کل تین شعر نقل کیے ہیں۔ مدنی صاحب کے یہاں اشعار کی مجموعی تعداد آٹھ ہے جن میں مالک رام صاحب کے نقل کردہ تینوں شعر بھی شامل ہیں۔ راقم السطور کو مختلف ذرائع سے ان کا جو کلام دستیاب ہوا ہے، وہ نو اشعار کی ایک مکمل غزل، تین غزلوں کے چار متفرق اشعار اور دو، دو اشعار کے دو قطعات تاریخ یعنی کل سترہ شعروں پر مشتمل ہے۔ مالک رام صاحب اور مدنی صاحب کے پیش کردہ آٹھ اشعار کے علاوہ باقی نو شعر سطورِ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

پستاں انار، رشکِ گل تر عذار ہے	پھولا پھلا ہوا چمنِ حسنِ یار ہے
اتنا غرورِ حسنِ دو روزہ پہ کس لیے	غافل! عروج نشہ کو آخر خمار ہے
چھاتی سے کیوں لگائے نہ رکھوں میں روز و شب	ناسورِ سینہ دل کا مرے یادگار ہے
کیفیتیں نئی ہیں خراباتِ دہر کی	جو ہوش میں نہیں ہے وہی ہوشیار ہے
دلِ مائل کی چند سے آپ کو لازم رعایت ہے	یہ میرا ناز پروردہ گرفتارِ مصیبت ہے

قطعۂ تاریخ طباعت "چمنستانِ جوش"

ہر اک شعر ہے جوش کا رشکِ شعری	زمینِ غزل غیرتِ اوج پروین
چھپا جب کہ دیوانِ عطار دہ پکارا	یہ تاریخ ہے "برق جلوہ مضامین"
	۱۲۸۷ھ

قطعۂ تاریخ انطباع مثنوی سحر بن

مثنوی کے سب ہیں خوش اسلوب شعر	چلبلے مضمون ہیں، مجبوب شعر
دل یہ کہتا ہے کہ سالِ دل فروز	آپ لکھیں جلد "موزوں خوب شعر"
	۱۲۸۷ھ

(۲۷) میر احمد علی رسا رام پوری: "۳ راگست ۱۸۹۱ء (۶ر محرم ۱۳۰۹ھ) کو تقریباً چہتر برس کی عمر میں عالم فانی سے کوچ کیا۔" (حاشیہ ص ۲۶۱) اخبار "دبدبہ سکندری" رام پور مورخہ ۱۱ر محرم ۱۳۰۹ھ مطابق

۱۷ اگست ۱۸۹۱ء کے بموجب صحیح تاریخ وفات پنجشنبہ ۶ محرم ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۲ اگست ۱۸۹۱ء ہے۔

(۲۸) نواب یوسف علی خاں ناظم :۔ (الف) "نواب احمد علی خان بہادر لاولد فوت ہوئے تھے" (ص ۲۷۳) یہ صحیح نہیں۔ ان کی اولاد میں ایک بیٹی شمسہ تاج دار تھیں جن کی حکمرانی روہیلوں نے قبول نہیں کی۔ (ب) "نواب محمد سعید خاں نے ..... ۷۱ برس کی عمر میں ۱۹ مئی ۱۸۵۵ء (۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ) کو ..... رحلت فرمائی" (ص ۲۷۳) صحیح تاریخ وفات ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ مطابق یکم اپریل ۱۸۵۵ء ہے (ج) "ناظم ۵ مارچ ۱۸۱۶ء (۵ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ) کو پیر کے دن پیدا ہوئے" (ص ۲۷۴) صحیح تاریخ ولادت دوشنبہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ مطابق ۴ مارچ ۱۸۱۶ء ہے۔

(۲۹) ہرگوبند سہائے نشاط اکبر آبادی :۔ دیوان کا نام "نشاط الاحباب" بتایا گیا ہے۔ (ص ۲۸۰) صحیح نام "نشاط احباب" ہے۔ یہ دیوان مطبع نول کشور کان پور سے ۹ جنوری ۱۸۷۷ء کو چھپ کر شائع ہوا۔

(۳۰) نواب مردان علی خاں نظام و رعنا مراد آبادی :۔ "تلامذۂ غالب" کے مطابق "۱۸۶۷ء میں مارواڑ میں نائب دیوان مقرر ہوئے۔ بعد میں دیوان ہو گئے"۔ (ص ۲۸۲) صحیح یہ ہے کہ ریاست مارواڑ سے بحیثیت نائب دیوان ان کا تعلق ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا۔ دیوان کے عہدے پر ۱۸۶۹ء میں ترقی پائی۔ جمشید علی خاں جم مراد آبادی (شاگردِ غالب) نے اس موقعے پر مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کہہ کر مبارکباد پیش کی تھی۔

کنوں چوں نائبِ سرکارِ ذی شاں	شدہ نواب مردان علی خاں
سر اعدا برید ہ گفت ہاتف	عروج خالق مہر درخشاں

(۱۸۷۰ – ۱ = ۱۸۶۹ء)

نظام کی تصانیف کی تفصیل پیش کرتے ہوئے فاضل مصنف رقم طراز ہیں کہ "تاریخ میں ایک مبسوط کتاب "تاریخ المیلاد" (۱۲۷۷ھ) لکھی۔ علم موسیقی میں

بھی دو کتابیں یادگار ہیں، نغمۂ صنم اور غنچۂ راگ (۱۲۷۹ھ) ریاست جودھپور کی تاریخ تواریخ مارواڑ (۱۸۶۹ء) کے نام سے لکھی۔ دو کتابیں مسمریزم کے مضمون پر بھی لکھیں۔ سیر غایت (۱۲۸۳ھ) اور طلسم نظر (۱۲۸۹ھ)...... (ص ۲۸۳) نظام کی تمام کتابوں کے نام تاریخی ہیں لیکن متذکرۂ بالا چھ کتابوں میں سے چار کے ناموں سے آگے دیے ہوئے سنہ برآمد نہیں ہوتے "تاریخ البلاد" سے ۱۲۷۷ھ کے بجائے ۱۲۷۹ھ برآمد ہوتا ہے یہی اس کا سال تصنیف بھی ہے "نغمۂ صنم" اور "غنچۂ راگ" دونوں کے آگے ۱۲۷۹ھ مرقوم ہے۔ "غنچۂ راگ" اسی سال لکھی گئی

لیکن "نغمۂ صنم" اس سے چار سال قبل ۱۲۷۵ھ میں لکھی جا چکی تھی۔ ریاست جودھپور کی تاریخ کا اصل نام "تواریخ مارواڑ" ہے۔ اسی طرح مسمریزم سے متعلق پہلی کتاب کا نام "سیر غایت" کی بجائے "سیر غایب" ہونا چاہیے۔ آخر الذکر دونوں ناموں میں اس تصحیح کے بغیر ان سے مطلوبہ سنہ حاصل نہ ہوں گے۔

واسوخت "ضبطِ عشق" کے بارے میں مالک رام صاحب کا ارشاد ہے کہ یہ کلیاتِ نظام مطبوعہ دسمبر ۱۸۷۵ء کے علاوہ منشی فدا علی عیش کے مرتبہ مجموعہ واسوخت "شعلۂ جوالہ" (مطبوعہ ۱۸۶۹ء) کی دوسری جلد میں بھی شامل ہے اور اس میں کل ۳۲۴ بند ہیں (ص ۲۸۴) متذکرہ واسوخت پہلی بار ۱۲۸۱ھ (۶۵-۱۸۶۴ء) میں جو اس کا سال تصنیف بھی ہے غالباً مطبعِ نولکشور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ۱۴۱ بند تھے۔ اس اشاعت اول کا ایک نسخہ جس کا سرورق ضائع ہو چکا ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ سالِ طباعت مرزا مہر گوپال تفتہ اور گوبند پرشاد فضا کے قطعاتِ تاریخ سے برآمد ہوتا ہے۔ تفتہ کا قطعۂ تاریخ درج ذیل ہے۔

طبع شد تا چہ در زبانِ سعید	ایں دل آرا و دل نشیں واسوخت
تفتہ از دل چو سال طبعش خواست	گفت "جاں را فدا بایں واسوخت"

(۱۲۸۱ھ)

"قصائدِ مدحیۂ نظام" کے مقدمے میں مالک رام صاحب کی متذکرہ کتابوں کے علاوہ ایک اور رسالے "نوائے غریب" کا نام بھی شامل ہے۔ اس نام سے رسالے کا سالِ تصنیف ۱۲۷۹ھ حاصل ہوتا ہے۔

(۳۱) وحیدالدین خاں وحید دہلوی :۔ "تلامذۂ غالب" سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۷۶ء (۱۲۹۲ھ) میں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ حیدر آباد دکن منتقل ہو گئے (ص ۲۹۴۔۲۹۵)۔ اولاً ۱۸۷۶ء کی ۱۲۹۲ھ سے مطابقت صحیح نہیں کیونکہ ۱۸۷۶ء کا آغاز ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کی چوتھی تاریخ کو ہوا تھا۔ ثانیاً گلدستۂ "مشاعرۂ دہلی" بابت ماہ جون ۱۸۷۸ء مطابق جمادی الآخر ۱۲۹۵ھ سے معلوم ہوتا ہے کہ وحید اس مشاعرے میں شریک تھے۔ اس لیے ۱۸۷۶ء میں دہلی سے ترکِ وطن کے بعد حیدرآباد کی طرف ہجرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۳۲) نواب میر ابراہیم علی خاں وفا سہسوانی :۔ صاحب تلامذہ کا بیان ہے کہ "وفا" غالباً ۱۸۳۵ء اور ۱۸۴۰ء کے درمیان پیدا ہوئے ...... بڑودہ کے منشی عبدالقادر کی صاحبزادی سے عقد نکاح ہوا جن سے چار بیٹے ہوئے میر احتشام علی خاں، میر ناصر علی خاں میر یوسف علی خاں اور میر محمود علی خان... میر ابراہیم علی خاں نے ۱۸۸۵ء میں بڑودہ میں انتقال کیا"۔ (ص ۲۹۶)

وفا کا تاریخی نام سید غلام حسن [۱۲۶۳] تھا۔ جس کے مطابق ان کی ولادت ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں ہوئی تھی۔ بیٹوں کے ناموں میں یوسف علی خاں کا نام ناصر علی کے نام سے پہلے آنا چاہیے۔ حکیم احمد حسن فدا کی تحریر کے مطابق میر ناصر علی میر صاحب موصوف کے پسر سوم تھے۔ میر احتشام علی خاں ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں، میر ناصر علی ۱۲۹۰ھ (۷۴۔۱۸۷۳ء) میں اور میر محمود علی خان ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) میں پیدا ہو گئے تھے۔ میر یوسف علی کا سالِ ولادت نامعلوم ہے احتشام علی خاں سے چھوٹی ایک بہن جمیل النساء تھیں جو ۱۲۸۷ھ (۷۱۔۱۸۷۰ء) میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ دو صاحبزادیاں سراج النساء اور سرفراز النساء عرف جستی بیگم

اور تھیں جن کے سنینِ پیدائش معلوم نہیں۔ فرزند اکبر میر احتشام علی خاں کی ولادت ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ روز یکشنبہ (۱۶ اگست ۱۸۶۸ء) کو ہوئی تھی۔ غالب نے اس موقع پر میر ابراہیم علی خاں کو مبارک باد دیتے ہوئے لکھا تھا۔

"حضرت سید احمد حسن خانصاحب مدظلہ العالی کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ کے گھر مولودِ مسعود پیدا ہوا۔ ایک عبارت رنگین مرتب کرکے "اکمل الاخبار" میں، میں نے چھپوا دی ہے اور ایک رباعی اور ایک قطعہ سید صاحب ممدوح کا جو انھوں نے یہاں بھیجا تھا، وہ بھی چھپوا دیا...... اپنی لکھی ہوئی رباعی اور قطعہ عرض کرتا ہوں۔ رباعی

حق داد بہ سید زپے انعامش	فرخ پسرے کہ واجب است اکرامش
تاریخِ ولادتش بود بے کم و بیش	"ارشاد حسین خاں" کہ باشد نامش
	۱۲۸۸ھ

قطعہ

غالب! حالِ سنینِ ہجری	معلوم کن از "خجستہ فرزند"
چون یک صد و بیست و چار ماند	این است شمارِ عمرِ دلبند

یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سنہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ جب "خجستہ فرزند" کے اعداد میں سے ۱۲۸۵ء لے لیے جائیں تو ایک سو چوبیس بچتے ہیں۔ ان کو میں نے دعا عمر مولود قرار دیا۔ حق تعالیٰ اس مولود کو تمھارے سامنے عمر طبعی کو پہنچائے۔"[۱]

غالب کی مرتب کی ہوئی مذکرہ بالا عبارت رنگین "اکمل الاخبار" کے ۲ ستمبر ۱۸۶۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ چونکہ اس خبر کو مہتمم اخبار کی طرف سے شائع ہونا تھا، اس لیے غالب نے اس میں اپنا ذکر بصیغہ غائب کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

بفضلِ الٰہی ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ کو روز یکشنبہ گھنٹہ بھر

دن رہے جناب معلّی القاب نواب میر ابراہیم علی خان بہادر رئیس اعظم سورت کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ گویا نواب صاحب چاند تھے اور یہ چاند کے پاس ایک روشن ستارہ چمکا۔ حق تعالیٰ اس ماہِ رخشندہ و اختر تابندہ کو اوجِ عزت و اقبال پہ تا طلوعِ آفتابِ قیامت پُر نور و ضیا گستر رکھے۔ جنابِ مستطاب نجم الدولہ نواب اسد اللہ خان غالب بہادر مدظلہم نے ایک رباعی اور ایک قطعۂ تہنیت نئی طرز کا کہ دیکھنے والے بشرطِ دید و فہم اس کا لطف اٹھائیں گے ارشاد فرمایا ہے۔ ہم بہ (غرض) افزائشِ رونقِ اخبار رباعی و قطعہ لکھتے ہیں.....[۱]

وفا کے سالِ وفات کے سلسلے میں مالک رام صاحب اور ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی دونوں ۱۸۸۵ء پر متفق ہیں[۲] لیکن یہ اطلاع درست نہیں۔ راقم السطور کے ذخیرۂ نوادر میں وفا کی صاحبزادی جمیل النساء بیگم اور فرزند اکبر میر احتشام علی خاں کی شادیوں کا دعوت نامہ محفوظ ہے۔ یہ دونوں شادیاں بالترتیب ۱۹؍ جمادی الثانیہ اور ۲۲؍ جمادی الثانیہ ۱۳۰۴ھ کو ہوئی تھیں اور متذکرہ دعوت نامہ جس میں نکاح کی یہ دونوں تاریخیں خود وفا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں، انھوں نے اپنے دستخط اور تاریخِ تحریر کے ساتھ "یکم شہر جمادی الثانی جمعہ ۱۳۰۴ھ" (۲۵؍ فروری ۱۸۸۷ء) کو بڑودہ سے میرے نانا منشی شاکر حسین نکہت مرحوم کے نام ارسال کیا تھا۔ اس کے چھ ماہ بعد ۲۵؍ اگست ۱۸۸۷ء کو نانا مرحوم نے اپنے عم محترم منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کی فارسی مثنوی "تاج الکلام" کی چند جلدیں ان کی خدمت میں روانہ کیں۔ وفا نے اس تحفے کی رسید میں جو خط لکھا تھا، حسنِ اتفاق سے وہ بھی محفوظ ہے۔ ڈاک خانہ کی نیم واضح مہروں کے مطابق یہ خط ۲۰ یا ۲۲؍ اکتوبر ۱۸۸۷ء کو بڑودہ سے روانہ ہو کر اسی ماہ کی کسی تاریخ کو بھوپال پہنچا تھا۔ اگلے سال ۱۵؍ اگست کو نکہت

مرحوم نے "بطلبِ خیریت مزاج" وفا کے نام ایک اور خط لکھا جس کے بعد دونوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ یہ آخری خط مکتوب الیہ کے مرض الموت کے زمانے میں لکھا گیا تھا، اس لیے ۱۸۸۵ء کے بجائے ۱۸۸۸ء کو ان کا سالِ وفات قرار دینا زیادہ قرینِ صحت ہوگا۔ ۱۵ اگست ۱۸۸۸ء تک موصوف کا بقیدِ حیات ہونا بہر حال مسلّم ہے۔

غالب نے سید احمد حسن فدا کے نام چہار شنبہ، ۱۷ جنوری ۱۸۶۶ء کے خط میں لکھا ہے کہ "آپ کا حکم بے تکلف مانوں گا۔ جناب میر ابراہیم علی صاحب اور جناب میر عالم علی خاں صاحب کی خدمت گذاری کو اپنا شرف جانوں گا"[۲۴] اس تحریر سے یہ معلوم ہوتا کہ یہ دونوں حضرات ۱۸۶۶ء کے شروع میں مرزا غالب کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے تھے۔

(۴۳) "تلامذۂ غالب" میں جہاں بعض شاعروں کا ذکر ناکافی معلومات کی بنا پر انتہائی اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے وہیں بعض ایسے شاعر اس کے صفحات سے یکسر غیر حاضر ہیں جن کے غالب سے استفادے کی شہادتیں خود ان کے فارسی و اردو خطوط میں موجود ہیں۔ فاضل مصنف نے دیباچے میں اس کی توجیہ فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ

> اس تذکرے کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے بھی شاعر تھے کہ ان کا صرف تخلص ہی معلوم ہو سکا، نام اور کلام تک رسائی نہ ہوئی مثلاً آزردہ وغیرہ۔ میں نے دانستہ اس سلسلے میں ان کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ محض فہرست کو لمبا کرنا مقصود نہیں تھا۔ بعض اصحاب ایسے تھے کہ ان کا نام اور تخلص دونوں معلوم ہو گئے۔ اگرچہ نہ مفصل حالات ملے، نہ زیادہ کلام ہی ہاتھ لگا۔ .... انھیں البتہ میں نے سلسلے میں درج کر لیا ہے (ص ۷، ۸)

راقم السطور کی ناقص معلومات کے مطابق غالب کے مذکورہ بالا قسم کے

شاگردوں میں آزردہ کے علاوہ کوئی ایسا شاعر نہیں جس کی شخصیت یکسر ناقابلِ تعارف ہو۔ جہاں تک آزردہ کا تعلق ہے، ان کے بارے میں خود غالب یہ لکھتے ہیں کہ "اب یہ بھی یاد نہیں آتا کہ آزردہ کا نام کیا ہے اور وہ کون ہے اور کہاں کا ہے؟" باقی شاگردوں کے متعلق غالب کی تحریروں اور دوسرے مآخذ میں جو معلومات محفوظ ہیں، ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) پنڈت بدری داس :۔ یہ کرنال میں ڈاک منشی تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں غالب نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "باآنکہ مجھ سے اس سے ملاقات ظاہری نہیں ہے مگر میں جب جیتا تھا تو وہ اپنا کلام اصلاح کے واسطے میرے پاس بھیجتا تھا۔ بعد اپنے مرنے کے میں نے اس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس بھیج دیا کرو۔"

(۲) آغا غلام حسین سرور تبریزی :۔ سورت کے نواب میر افضل الدین قمر الدولہ حشمت جنگ (۱۲۳۷ھ/ ۲۲-۱۸۲۱ء تا ۱۲۵۸ھ/ ۲-۱۸۴۲ء) کی سرکار میں میر منشی کے منصب پر فائز تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں مشقِ سخن کرتے تھے۔ علاوہ بریں تاریخ گوئی سے بھی خصوصی شغف تھا چنانچہ "حقیقت السورت" اور "تاریخ گجرات" میں ان کے متعدد قطعاتِ تاریخ منقول ہیں۔ "سخنورانِ گجرات" میں ان کے مختصر حالات موجود ہیں لیکن غالب سے تلمذ کا ذکر نہیں۔ استادی و شاگردی کے اس تعلق کا انکشاف خود غالب کے ایک خط موسومہ میاں داد خاں سیاح سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ

> آغا غلام حسین خاں صاحب کا خط پہنچا۔ اس میں کچھ تو شعر اصلاح طلب بھی تھے۔ اب اصلاح دے کون! میں تو اپنی مصیبت میں گرفتار ہوں، بارے ایک میرا شاگردِ رشید منشی ہرگوپال تفتہ بہ سواری ریل میرے دیکھنے کو آیا تھا۔ اس کو موقع و محل بتا دیا۔ جو میں کہتا گیا اسی طرح وہ بناتا گیا۔ وہ قطعہ کا کاغذ بعد اصلاح کے اکمل المطابع میں بھیج دیا۔ ہفتۂ آئندہ

میں تم بھی دیکھ لو گے"[۴۶]

"سخنوران گجرات" میں ان کے نمونہ کلام میں صرف ایک قطعۂ تاریخ منقول ہے، جس کے چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

شیخ فاضل! شادی ابنِ برادر زادہ ات	مر ترا بادا مبارک اے شفیق و مہرباں
ایں ہمہ آرائش و زیبائشِ محفل تمام	آمد از عقلت نمایاں، اے زہے عقلت جواں
لازم آمد بہ خودم تا من نگارم تہنیت	زاں برائے او بخودم تہنیت را من بیاں
ایں نوید شادمانی چوں بگوشِ من رسید	غوطہ ور گشتم بہ بحرِ فکرِ سالش در زماں
عقل آمد رہبرم گفتا کہ سرور گوش کن	"جشنِ فرخندہ" ز روئے جشن گو تاریخِ آں

(۱۲۹۲ + ۳ = ۱۲۹۵ھ)

(۳) نواب علی بہادر علی مسند نشین باندہ:- غالب نے کلکتہ جاتے ہوئے باندہ میں ان کے یہاں قیام کیا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کی ایک غزل کے مقطعے میں دعائیہ انداز میں ان کا ذکر بھی کیا ہے فرماتے ہیں۔

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز ... دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

بعض تذکروں مثلاً "سخن شعرا" (مولفہ عبدالغفور خاں نساخ) اور "ارمغانِ گوکل پرشاد" میں ان کا ذکر موجود ہے لیکن کسی نے غالب سے تلمذ کی طرف اشارہ نہیں کیا مگر خود غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ علی بہادر ان سے باقاعدہ اصلاح لیتے تھے۔ لکھتے ہیں:

> اوراقِ اشعار را از ہم کشودم و سرود مخمس و مسدس و غزلیات را خواندم ..... زہے لطفِ طبع و جدتِ ذہن و سلامتِ فکر و حسنِ بیان۔ ہرگاہ در آغاز چنیں بودہ اند، بشرطِ دوام ورزش و التزامِ مشق حقا کہ در اندک مایہ مدت علم یکتائی خواہند افراخت۔ فرمان بجا آوردم و آں شاہدانِ معنوی را بجلب و اصلاح آرائش کردم .....[۴۷]

(۴) زین العابدین فرق:- ان کا ذکر غالب نے مرزا یوسف علی خاں عزیز

کے نام کے ایک خط میں اس طرح کیا ہے کہ "کل زین العابدین فوق کا خط مع اشعار کے ٹکٹ لگے دار لفافہ کے اندر رکھ کر بسبیل ڈاک بھجوا دیا ہے۔ آج صبح کو تمھارا خط آیا، دوپہر کو میں نے جواب لکھا، تیسرے پہر کو روانہ کیا"[۴۹] نحوائے کلام سے ظاہر ہے کہ جس وقت یہ خط لکھا جا رہا تھا، مکتوب الیہ اور فوق دونوں ایک ہی شہر میں مقیم تھے عزیز کا اصلی وطن بنارس تھا اور غالب کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ دنوں آگرے میں بھی مقیم رہے تھے، اس لیے عین ممکن ہے کہ فوق آگرہ یا بنارس کے متوطن ہوں۔ چونکہ اسی خط میں آگے چل کر غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے تذکیر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے۔" اس لیے اس خط کی تحریر کے وقت عزیز کا آگرہ کی بہ نسبت بنارس میں قیام پذیر ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔

(۵) نجیب خاں:۔ ان کا ذکر حبیب اللہ ذکا کے نام کے خطوں میں آیا ہے پہلا خط دوشنبہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۴ء کا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ "دونوں خط آپ کے اور ایک پارسل محمد نجیب خان کا بہ تقدیم و تاخیر دو سہ روزہ موصول ہوئے۔ آپ کا پارسل بعد مشاہدہ آپ کو بھیجا جائے گا۔ خان صاحب کے پارسل میں ایک کتاب ارمغان اور اوراق اصلاح بھیجے جائیں گے"[۵۰] دوسرا خط اس کے آٹھ دس روز بعد یعنی دسمبر ۱۸۶۴ء کے پہلے ہفتے میں لکھا گیا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں کہ "صحیفہ شریفہ کی رسید لکھ چکا ہوں بلکہ اسی خط میں محمد نجیب خاں کو سلام اور ارمغاں کا شکریہ اور اوراق اشعار اصلاح طلب کی رسید میں نے لکھ دی ہے"[۵۱] ان خطوط سے ضمناً یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد نجیب خاں حیدر آباد کے متوطن تھے۔ یا کم از کم اسی زمانے میں وہاں مقیم تھے۔

(۳۴) تلامذہ غالب میں متعدد ایسے شاعر بھی شامل ہیں جن کے غالب سے مشورۂ سخن کی تصدیق خود غالب کی کسی تحریر سے نہیں ہوتی لیکن معاصر تذکروں اور گلدستوں میں شاگردِ غالب کی حیثیت سے ان کا ذکر موجود ہے۔ سطور ذیل میں ایسے ہی مزید چند شاعروں کے نام پیش کیے جاتے ہیں جن کا ذکر نہ تو "تلامذہ غالب" میں موجود ہے اور نہ اس سلسلے کے کسی مضمون پر راقم السطور کی نظر سے گزرا ہے۔

(۱) منشی آغا علی سہسوانی:۔ مولانا سید اعجاز احمد معجز سہسوانی نے "تاریخ سہسوان" میں بزمرۂ شعراء ان کے نام کے ساتھ "تلمیذ غالب" لکھا ہے مزید حالات معلوم نہیں۔ البتہ منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ سے سال وفات ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) برآمد ہوتا ہے

رفت چوں آغا علی از دار فانی یک بیک ۔۔۔ زد رقم تسلیم محزوں بہر سال ماتمش
طبع بیتابی گرفت و نالہ را بگزید دل ۔۔۔ دست افسوس آشنا شد سر بسر اندر غمش
(۸۱ + ۴۲۵ ، ۸۶ + ۳۴ ۔۔۔ ۴۶۴ + ۲۰۷ = ۱۲۹۷ھ)

(۲) محمد کریم الدین خستہ :۔ ان کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ملا لیکن محمد حشمت علی خاں موحد رام پوری شاگرد مومن کے دیوان مطبوعہ مطبع احمدی کانپور بابت ۵ محرم ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) میں ایک قطعہ بعنوان "قطعہ محمد کریم الدین صاحب متخلص بہ خستہ شاگردِ غالب کے دیوان چھپنے کی تاریخ" موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب دیوان شاگرد تھے اور ان کا یہ دیوان ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں چھپ بھی چکا ہے۔ قطعہ یہ ہے

چھپا جب ہر طرح سے پاکے ترتیب ۔۔۔ بہ امداد خدا دیوانِ خستہ
تو موحد غیب سے ہاتھ آئی تاریخ ۔۔۔ سنا ہے چھپ چکا دیوانِ خستہ
۱۲۹۶ھ

(۳) منشی شیام لال عاصی:۔ یہ کسی زمانے میں بندیل کھنڈ ایجنسی کے میر منشی تھے۔ چنانچہ انھوں نے "تاریخ بندیل کھنڈ" کے نام سے اس علاقے کی ایک تاریخ بھی لکھی ہے جو ۱۸۸۴ء میں چھپ چکی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں خود انھی کا کہا ہوا ایک قطعۂ تاریخ ہے جس کے چوتھے شعر میں انھوں نے غالب سے کسبِ فیض کا دعویٰ کیا ہے۔ قطعۂ مذکورہ کے تین شعر درج ذیل ہیں۔

تحقیقِ معتبر سے لکھا ہے تمام حال ۔۔۔ دل ہر بشر کا دیکھنے سے جس کے شاد ہے
دعویٰ سخن وری کا نہیں مجھ کو زینہار ۔۔۔ کرتا ادب سے عرض یہ خاکی نہاد ہے
حاصل مجھے لیاقتِ ذاتی نہیں دلے ۔۔۔ غالب سے فیضیاب یہ ہندی نژاد ہے

(۴) بی شاماں جان فتنہ :۔ ان کی ایک طرحی غزل گلدستہ "نتیجۂ سخن" کلکتہ کے اپریل ۱۸۸۵ء کے شمارے میں شامل ہے۔ اس غزل کے سرعنوان ان کا پورا نام "بی شاماں جان طوائف ساکنۂ کلکتہ متخلص بہ فتنہ خوشہ چینِ خرمنِ غالب" لکھا ہوا ہے۔ غزل کے چند اشعار ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں :

الجھن میں دل کو ڈال دیا ہے دکھا کے ہاتھ | زلفِ سیاہ یار کے ہیں کس بلا کے ہاتھ
ہے ایسی موجِ اشک ندامت بڑھی چڑھی | افسردہ دل میں آتشِ رنگِ حنا کے ہاتھ
ہاتھ آگیا مگر کسی پہلو سے نقدِ دل | بھولے نہیں سماتے ہیں دزدِ حنا کے ہاتھ
لے چینیوں سے ہوا بھی پامال دل مرا | دکھلائے گروہ فتنۂ محشر ادا کے ہاتھ

(۵) محمد علی عاقل دہلوی :۔ منشی گوکل پرشاد رسا ساکن قصبہ کھجوا ضلع فتحپور نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"محمد علی دہلوی خلف مرزا حسین علی بیگ مرحوم شاگرد غالب و ذوق دہلوی، بالفعل ہاتھرس کے اسکول انگریزی میں مدرس ہیں۔ آپ کی تصانیف میں ایک دیوان اور مثنوی سرایت عشق یادگار ہیں۔ حکمت سے بھی آگاہی رکھتے ہیں۔ حکیم مشتاق علی کاکوروی کے شاگرد ہیں۔"[۱۵]

(۳۵) "تلامذۂ غالب" میں متعدد شعراء کے انتخاب کلام میں ایسے اشعار شامل ہیں جو غالب سے ان کے رشتۂ تلمذ کی تائید و توثیق کرتے ہیں۔ آئندہ سطور میں اسی قسم کے کچھ اور اشعار پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ انھیں اگلے ایڈیشن میں شامل کیا جا سکے ان اشعار کا اضافہ تحقیقی نقطۂ نظر سے کتاب کو مزید معتبر و مستند بنانے میں معاون ثابت ہوگا۔

ہم چو غالب در جہاں یک نکتہ سنجے برنخاست | من فدائے لطفِ او باقر کہ استاد منست
(شاہ باقر علی باقر)

جہاں میں حضرتِ غالب کے بعد جمؔ افسوس — نظر نہ کوئی سخن سنج دور دور آیا

(جمشید علی خاں جمؔ مرادآبادی)

راقمؔ اچھا نہیں، برا نہ کہو — اسد اللہ کی نشانی ہے

(خواجہ قمرالدین راقمؔ)

غالب کے ہو شاگرد سخنؔ کہتے ہو کیا خوب — ہر شعر میں ملتا ہے مزا ایک غزل کا

اس شہر میں غالب کا جو شاگرد سخن ہے — دشمن پہ ہمیشہ ہے وہ غالب ہے سخن میں

(فخرالدین حسین سخنؔ)

ہے تلمذ اسد اللہ سے ہم کو سیاحؔ — شاعروں میں ہو نہ کیوں فخر ہمارا اپنا

ظلِ کرم ہے حضرتِ غالب کا بس مجھے — سر پہ نہیں ہے سایۂ ظلِ ہما نہ ہو

(میاں داد خاں سیاحؔ)

نخستیں کہ دادِ سخن دادہ ام — بنزدیکِ غالب فرستادہ ام

دو سہ سال ازو مشورت خواستم — ز اصلاحِ اُو تربیت خواستم

(ولایت علی خاں عزیزؔ صفی پوری)

بنائیں قدرؔ کی غزلیں جوابِ غالب نے — تمام جوہرِ تیغِ زباں ابھر آئے

(غلام حسنین قدرؔ بلگرامی)

طرز کا حضرتِ غالب کے تتبع ہو اگر — وہ تو مجروحؔ ہو سرمایۂ صد ناز مجھے

(میر مہدی مجروحؔ)

کشورِ ہند میں مقصودؔ ہر اک شاعر سے — میرے استاد کے ہیں وصف خداداد الگ

(مقصود عالم مقصودؔ بہالوی)

طالب اسد اللہ کا، غالب کا ہوں شاگرد — بیعت مجھے بے واسطہ ہے شیرِ خدا سے

(مردان علی خاں نظام و رعنا)

بجا لاؤ وفاؔ شکرِ خدا، ہو صاحبِ قسمت — کیا استاد اپنا تم نے غالب سے سخنداں کو

(میر ابراہیم علی خاں وفاؔ)

(۳۶) دو تخلص کرنے والے شاعروں کا ذکر مالک رام صاحب نے عموماً اردو میں طبع آزمائی کے لیے مخصوص یا بعد میں اختیار کردہ تخلص کے تحت کیا ہے۔ یہ طریق کار اصولی طور پر بالکل درست ہے لیکن اس پر التزام کے ساتھ عمل نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ حکیم محمد مراد علی کا ذکر بیمار تخلص کے تحت کیا گیا ہے حالانکہ وہ بعد میں ہوشیار تخلص کرنے لگے تھے۔ اسی طرح قاضی عنایت حسین بدایونی کا حال رشکی تخلص کے تحت لکھا گیا ہے۔ جب کہ انھوں نے وفات (۶ صفر ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۱۸ء) سے کم از کم چالیس سال پہلے یہ تخلص ترک کر کے فراق تخلص اختیار کر لیا تھا۔ ان شعرا کے حالات میں ضمناً بھی تخلص کی اس تبدیلی کا ذکر موجود نہیں۔ بیمار کے حالات کے ماخذ میں بھی غالباً اس طرف اشارہ نہیں کیا گیا لیکن رشکی سے متعلق مصنف کے ایک ماخذ "تجلیاتِ سخن" میں ان کے دونوں تخلص مذکور ہیں۔

شیخ محمد صادق علی گڑھ مکتیشری بھی سوزاں اور مداح دو تخلص کرتے تھے۔ ان کا تذکرہ تخلصِ اول کی رعایت سے ردیف "س" کے تحت کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرا تخلص بھی سرِ عنوان موجود ہے۔ آئندہ سطروں میں بیک وقت دو تخلصوں کے اس التزام کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عام عاشقانہ کلام میں تخلص سوزاں تھا اور نعتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مداح ہی استعمال کیا ہے" (ص ۱۵۴) بظاہر یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ "دیوانِ مداح" کی اشاعت کے بعد کے غیر نعتیہ کلام میں بھی یہ تخلص موجود ہے۔ مثال کے طور پر محمد ارتضیٰ خاں مہتمم مطبع مرتضوی دہلی کے رسالے "مراۃ الاشیاء" کے دو قطعاتِ تاریخ مع عنوان ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

قطعاتِ تاریخِ طبع از نتائجِ افکارِ ناظمِ بے بدل، ناثرِ بے مثل امیدوارِ خیر و فلاح محمد صادق علی صاحب مداح، مقیم سکندرہ راؤ، ضلع علی گڑھ تلمیذ باتمیز نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خاں بہادر

نظام جنگ غالب۔

شدہ طبع در مطبعِ ارتضی خاں
کتابے بحالاتِ شاہانِ ذی جاہ
رقم کرد مدّاح تاریخ طبعش
کہ دہ طبع گردیدہ مرآتِ اشباہ

۱۲۸۵ھ

در مطبوعہ چوں طبع شدہ عمدہ کتابے
باطرز خوش اسلوب و بزیبائی مضمون
مدّاح رقم کردہ چہ تاریخِ خجستہ
مطبوع شدہ نسخۂ بازیبِ ہمایوں

۱۲۸۵ھ

مندرجہ بالا عبارت اور ان قطعات سے صاف ظاہر ہے کہ صادق علی عام طور پہ مدّاح تخلص کے ساتھ ہی معروف تھے اور ان کا یہ تخلص صرف نعتیہ کلام کے لیے مخصوص نہیں تھا۔ اگر فی الواقع یہی صورت ہوتی تو وہ یہاں مدّاح کی بجاے سوزاں تخلص نظم کرتے۔

محمد مردان علی خاں مرادآبادی شروع میں مضطر تخلص کرتے تھے، بعد میں اسے بدل کر رعنا تخلص اختیار کر لیا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں جب انھوں نے مارواڑ میں دیوان کے عہدے پر ترقی پائی اور مہاراجہ کی طرف سے "نواب نظام الدولہ منتظم الملک، قائم جنگ" کے خطابات عطا ہوئے تو رعنا کے بجائے نظام تخلص کرنے لگے۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۷۵ء میں ان کا مجموعۂ کلام بھی "کلیاتِ نظام" ہی کے نام سے شائع ہوا۔ اس سے پہلے ۱۸۷۱ء میں منشی غلام محمد خاں تپش ان کی مدح میں کہے گئے قصیدوں کا مجموعہ "قصائد مدحیہ نظام" کے نام سے مرتب کر کے شائع کر چکے تھے مالک رام صاحب نے اسی مناسبت سے ان کا ذکر نظام تخلص کے ساتھ ردیف

نون کے تحت کیا ہے لیکن اُن کی اصل شہرت چونکہ غالب سے رشتۂ تلمذ پر منحصر ہے اور اس سلسلے کی بیشتر تحریریں رعنا تخلص کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہیں، اس لیے نظام یں کسی قدر غرابت محسوس ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ جناب امیر حسن نورانی نے اس کتاب میں ردیف الراء کے ذیل میں ان کا ذکر نہ پاکر اپنے ایک مضمون میں یہ لکھ دیا کہ "تلامذۂ غالب کے مؤلف نے ان کو اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا"[۵۴] تقریباً یہی صورتِ حال ایک اور شاعر سید دلاور علی جعفری ہاپوڑی کے سلسلے میں بھی پیش آئی ہے۔ "تلامذۂ غالب" میں ان کا حال طرزی تخلص کے تحت لکھا گیا ہے، جب کہ ان کا قدیم تر تخلص ثاقب تھا۔ اگرچہ حالات کے ضمن میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ "آغاز میں ثاقب تخلص کرتے اور آزردہ (مفتی صدرالدین) سے اصلاح لیتے رہے۔ استاد نے ثاقب بدل کر تخلص طرزی کر دیا" (چنانچہ) یادگارِ ضیغم میں نام ثاقب ہی کے تحت ہے۔" (ص ۳۰۵) اس کے باوجود جناب کلب علی خاں فائق رام پوری نے "تلامذۂ غالب" میں ثاقب تخلص کے تحت ان کے حالات موجود نہ ہونے کی بنا پر یہ فیصلہ صادر فرمادیا کہ "ان کا ذکر سہواً مالک رام صاحب سے رہ گیا ہے"[۵۵] سہل پسند قارئین و محققین کو اس قسم کے تسامحات اور غلط فہمی و غلط بیانی سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ اگلی اشاعت میں دو یا دو سے زیادہ تخلص کرنے والے تمام شعرا کے نام ان کے ہر تخلص کے ساتھ متعلقہ ردیف کے تحت درج فہرست کیے جائیں البتہ نمبر سلسلہ صرف اسی تخلص کے ساتھ لکھا جائے جس کے تحت کسی شاعر کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔

ایک آخری التماس یہ ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں اگر غالب کے خطوط اور دوسری تحریروں سے مختلف شعرا کے متعلق ایسے بیانات اخذ کرکے ان کے حالات میں شامل کر دیے جائیں جو استادی و شاگردی کے باہمی رشتے کی توثیق کرتے ہوں تو اس سے کتاب کی اہمیت و افادیت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ نثار احمد فاروقی صاحب نے اپنے تبصرے میں ایسے شعراء کی ایک لمبی فہرست پیش کی ہے جن کا غالب سے اصلاح لینا

ان کے نزدیک محتاج ثبوت ہے۔ علمی نقطۂ نظر سے اس قسم کے شبہات کا ازالہ بے حد ضروری ہے۔

حواشی

1. احمد حسن کاکوروی "بہار بے خزاں" میں جس کا سال ترتیب ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) ہے انوار تخلص کے تحت تسلیم کے حال میں لکھتے ہیں کہ "تذکرۂ شعرا جمع کردہ وداد سخن آفرینی یا دادہ" اس ضایع شدہ تذکرہ کے دو شکستہ و بوسیدہ ورق راقم السطور کے ذخیرۂ نوادر میں محفوظ ہیں۔ نغمہ سے متعلق بیان انہی میں سے ایک ورق سے ماخوذ ہے۔
2. خاندانِ لوہارو کے شعراء (شایع کردہ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۸۱ء) ص ۱۱۴۔
3. کلیات نثر غالب طبع چہارم۔ ص ۲۲۷، ۲۲۸
4. خم خانۂ جاوید جلد سوم ص ۱۰
5. ایضاً " " ص ۲۴۲
6. ایضاً " " ص ۳۰۴
7. تجلیاتِ سخن از نظامی بدایونی (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں: ۱۹۳۰ء مقدمہ از مولانا قمر الحسن بدایونی) ص ۲۹۔
8. تلاش غالب ص ۱۵۷
9. خم خانۂ جاوید، جلد چہارم ص ۳۹
10. "غالب اور سرور" از حبیب خاں ص ۶۱
11. سخن شعرا از مولوی عبدالغفور نساخ (مطبوعہ نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۷۴ء ص ۲۳۱۔

۶۲ھ "انسابِ شیوخ فرشوری بدایوں" ص ۱۰۵ بحوالہ "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" از محمد ایوب قادری (شائع کردہ پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۷۶ء) حاشیہ ص ۳۰۵۔

۶۳ھ تجلیات سخن ص ۳۳

۶۴ھ "انسابِ شیوخ فرشوری بدایوں" ص ۹۰-۹۲ بحوالہ "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" حاشیہ ص ۳۴۸۔

۶۵ھ ایضاً بحوالہ سابق، حاشیہ ص ۳۰۵۔

۶۶ھ خم خانۂ جاوید، جلد پنجم ص ۴۰۲، ۴۱۰

۶۷ھ اس مشاعرے کی غزلوں کا مجموعہ "گلدستہ انجمن" کے نام سے ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں مطبع اکبری واقع دہلی بمحلہ چوڑی گراں بر مکان شنبھو ناتھ میں" باہتمام سید ظہیرالدین حسین" چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ماہنامہ "ماہِ نو" کراچی شمارہ جنوری۔ فروری ۱۹۹۹ء ص ۶۴ تا ۷۰۔

۶۸ھ خم خانۂ جاوید جلد پنجم ص ۵۵۶، ۵۵۸۔

۶۹ھ حیوٰۃ العلماء از مولوی عبدالباقی سہسوانی (مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۹۲۳ء) ص ۷۱ و "خزینۃ الانساب" از ابوالعلاء سید نظر احمد سہسوانی (مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں۔ ۱۹۵۹ء) ص ۲۵۔

۷۰ھ دیوان فدا (شائع کردہ ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈمی، تمل ناڈو۔ مئی ۱۹۷۹ء) ص ۱۱، ۱۲

۷۱ھ مکتوب غالب بنام مولوی احمد حسن قنوجی مورخہ ۸ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء۔

۷۲ھ حیوٰۃ العلماء ص ۷۱

۷۳ھ خزینۃ الانساب ص ۲۵

۷۴ھ دیوانِ فدا ص ۳۳

۲۵۔ دیوانِ نورا ص ۴۸

۲۶۔ میر غلام بابا خاں نے مئی ۱۸۶۵ء میں غالب کو سورت آنے کی دعوت دی تھی، اس کے جواب میں چہار شنبہ، ۳۱ مئی ۱۸۶۵ء کو لکھتے ہیں کہ "یادآوری کا ممنون اور آپ کے دوامِ دولت کا دعاگو ہوں۔ اگر بوڑھا اور اپاہج نہ ہوتا تو ریل کی سواری میں فوراً آپ تک پہنچتا اور آپ کے دیدار سے شرف اندوز ہوتا"۔ (خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر طبع سوم، ص ۴۲۱) اس کے بعد میر صاحب موصوف نے انھیں دوبارہ غالباً اپنے فرزندِ اکبر میر مظفر حسین (تاریخی نام مجوزہ غالب سید مہابت علی خاں) کے ختنہ اور صاحبزادی کی "دبستان نشینی" کی تقریبات میں جو ماہ رجب ۱۲۸۳ھ (۱۰ نومبر تا ۹ دسمبر ۱۸۶۶ء) میں منعقد ہونے والی تھیں، شرکت کی دعوت دی۔ اس کا جواب دیتے ہوئے غالب نے ۲۴ نومبر ۱۸۶۶ء کے خط میں لکھا کہ "رقعہ گلگوں نے بہار کی سیر دکھلائی، بسواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آگئی، پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعفِ بصارت، ضعفِ دماغ، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ، ان سب ضعفوں پر ضعفِ طالع۔ کیوں کر قصدِ سفر کروں؟ تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں؟ گھنٹہ بھر میں دو بار حاجتِ پیشاب کی ہوتی ہے، ایک ہفتے، دو ہفتے کے بعد ناگاہ قولنج کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں، حالت جان میں نہیں۔ آنا میرا سورت تک کسی صورت حیزِ امکان میں نہیں" (خطوطِ غالب ص ۴۲۳، ۴۲۴) ان خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کو سورت کے سفر کی دعوتیں تو ضرور ملیں لیکن وہ اپنی جسمانی معذوریوں کے باعث اپنے شفیق و محسن میزبان کی مہمان نوازیوں اور نظارۂ بزمِ جمشیدی سے محروم رہے۔

۲۷۔ ماہنامہ "اردوئے معلّی" علی گڑھ شمارہ اکتوبر ۱۹۰۶ء ص ۲۔

۲۸۔ کلیاتِ قدر (مطبوعہ مطبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۳۰۸ھ (۹۱-۱۸۹۰ء) دیباچہ از سید ابن علی بلگرامی ص ۷، ۸۔

۲۹۔ خطوطِ غالب بنام نواب ضیاء الدین احمد خاں و تفضل حسین خاں مشمولہ

"خطوط غالب" مرتبہ غلام رسول مہر ص ۱۱۳ و ۴۳۵۔

۳۰ه "تلامیذ الرحمن" تذکرہ شعرائے سہسوان، قلمی، مسودۂ مصنف مملوکہ راقم (سال ترتیب ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء)

۳۱ه سخنوران گجرات (شائع کردہ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ ۱۹۸۱ء) ص ۳۲۵

۳۲ه ایضاً ص ۳۲۵

۳۳ه مکتوب مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۹ء، خطوط غالب ص ۴۳۳

۳۴ه سخنوران گجرات ص ۳۲۲ و خطوط غالب ص ۴۲۶۔

۳۵ه مکاتیب غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی (طبع دوم، ۱۹۴۳ء) تقریباً ص ۶

۳۶ه قصائد مدحیہ نظام (مطبوعہ مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۸۷۱ء) ص ۴

۳۷ه ایضاً ص ۲۲۵۔

۳۸ه دیوان فدا ص ۶۶

۳۹ه ایضاً ص ۶۶ و ۶۹

۴۰ه خط نمبر ۵۔ خطوط غالب مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ص ۴۲۸

۴۱ه بحوالہ "تحقیقی نوادر" از ڈاکٹر اکبر حیدری (شائع کردہ اردو پبلشرز لکھنؤ ۱۹۷۴ء) حاشیہ ص ۵۳۸، ۵۳۹۔

۴۲ه "تلامذۂ غالب" ص ۲۹۶ و سخنورانِ گجرات ص ۳۲۴۔

۴۳ه خطوطِ غالب مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ص ۴۳۲۔

۴۴ه مکتوب بنام۔ نواب ابراہیم علی خاں وفا مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۶ء۔ "خطوط غالب" مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ص ۴۲۷

۴۵ه خطوط غالب مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ص ۲۱۳

۴۶ه ایضاً ص ۲۵۷، ۲۵۸

۴۷ه کلیات نثر غالب، طبع چہارم ص ۲۳۲

۴۸ه خطوط غالب، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ص ۵۹۳۔

۴۹؎، ۵۰؎ ایضاً ص ۴۶۶، ۴۶۷

۵۱؎ تاریخ سہسوان مصنفہ مولانا سید اعجاز احمد معجز مسودۂ مصنف مملوکہ راقم

۵۲؎ " ارمغان گوکل پرشاد " مشمولہ سہ ماہی اردو " کراچی شمارہ نمبر ۱۔ ۱۹۷۵ء ص ۴۴۔ عاقل نے مردان علی خاں رعنا کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ کہا تھا جو " تلامذہ غالب " میں ان کے حالات میں شامل ہے۔ مالک رام صاحب نے اس قطعے کے ساتھ ان کا پورا نام " مرزا محمد علی بیگ " لکھا ہے (ص ۲۸۳) خمخانہ جاوید (جلد پنجم ص ۵۵۴، ۵۵۵) میں بھی عاقل تخلص اور حکیم مرزا محمد علی بیگ کے نام سے ان کا ذکر موجود ہے لیکن اس تذکرے سے ان کے حالات کے سلسلے میں بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دیوان معصوم علی خاں سوختہ نائب تحصیلدار علی گڑھ کی حسب فرمائش آگرہ میں چھپا تھا " اور ایک واسوخت بھی ان سے یادگار ہے۔

۵۳؎ بحوالہ سہ ماہی " اردو " کراچی شمارہ جنوری۔ مارچ ۱۹۶۹ء عکس نزاۃ الاشباہ مابین ص ۱۹۲، ۱۹۳

۵۴؎ " غالب نامہ " دہلی شمارہ جنوری ۱۹۸۱ء ص ۱۲۹۔

۵۵؎ سہ ماہی " اردو " کراچی شمارہ جنوری۔ مارچ ۱۹۶۹ء ص ۹۰

(دو ماہی " اکادمی " لکھنؤ، شمارہ جنوری۔ فروری ۱۹۹۳ء)

تلامذۂ غالب (طبع ثانی) پر ایک نظر

"تلامذۂ غالب" کا تازہ ایڈیشن مئی ۱۹۸۴ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن فروری ۱۹۵۷ء میں مرکز تصنیف و تالیف نکودر (پنجاب) سے شائع ہوا تھا۔ ۲۶ برس کے اس درمیانی عرصے میں اس کتاب پر متعدد تبصرے لکھے گئے اور غالب کے بعض شاگردوں کے بارے میں کئی اہم مضامین بھی شائع ہوئے جن کی وساطت سے اس موضوع سے متعلق نیا مواد بھی سامنے آیا اور سابقہ معلومات کی بہت سی خامیاں بھی دور ہو گئیں۔ متذکرہ تبصروں میں ایک تبصرہ راقم السطور کا بھی تھا۔ جو دو ماہی "اکادمی" لکھنؤ کے جنوری، فروری ۱۹۸۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ خود مالک رام صاحب کے الفاظ میں یہ اس سلسلے کا "سب سے مفصّل اور مفید مضمون" تھا چنانچہ اس کے بیشتر معروضات یا تو اس کتاب میں شامل کر لیے گئے ہیں یا ان کے مطابق متن میں مناسب ردّ و بدل کر دیا گیا ہے۔ اس طرح مختلف تبصروں کی روشنی میں اور بعض نئے مآخذ کی مدد سے اس تازہ ایڈیشن میں جو اضافے، ترمیمیں اور تبدیلیاں ہوئی ہیں، انھوں نے اس کتاب کو زیادہ جامع اور زیادہ مفید بنا دیا ہے۔ تاہم چونکہ لغزش خاصۂ بشری ہے، اس لیے کسی بھی تحقیقی کارنامے کے صد فی صد درست یا مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا چنانچہ "تلامذۂ غالب" کے اس دوسرے ایڈیشن میں بھی بعض ایسے بیانات موجود ہیں جو ترمیم و تصحیح کے طالب ہیں یا جن کے متعلق مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ پیش نظر سطور کی تحریر کا مقصد انھی قابل ترمیم اور وضاحت طلب مقامات کی نشاندہی

کرتا ہے۔

(۱) انجم۔ محمد علی خاں شیخ پوری انجم کو غالباً "بیاضِ جامع علی خاں" کے حوا[لے] سے غالب کے شاگردوں میں شامل کیا گیا

ان کے نمونۂ کلام میں راقم السطور کے مضمون سے فارسی کے جو دو قطعاتِ تاریخ نقل کیے
گئے ہیں، "اودھ اخبار" میں ان کے عنوان سے انجم کا شاگردِ غالب ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ تحر[یر]
مصنف کے بقول انجم ضلع مونگیر (بہار) کے قصبہ شیخ پورہ کے رہنے والے تھے (ص ۵۷) ہما[را]
خیال یہ ہے کہ مذکورہ محمد علی خاں انجم اور محمد علی خاں نامی مونگیری (کذا) جو بقول مصنف
"مونگیر کے رؤسا میں سے تھے" شخصِ واحد ہیں۔ موخر الذکر کے نمونۂ کلام میں بھی فارسی
کا ایک قطعۂ تاریخ ہی نقل کیا گیا ہے۔ یہ قطعہ خواجہ فخر الدین حسین سخن شاگردِ غالب کے
مجموعۂ کلام "دیوانِ سخن" کی تاریخِ طباعت ہے۔ اس کے عنوان میں قطعہ نگار کو "شاگردِ
جناب نواب اسد اللہ خاں غالب مرحوم" لکھا گیا ہے۔ لیکن اس قطعے میں انھوں نے
اپنا تخلص نظم نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود ممکن ہے کہ صاحبِ دیوان کا بیان درست ہو
اور وہ نامی اور انجم دونوں تخلص کرتے ہوں۔

انجم کے نمونۂ کلام میں تفتہ کی وفات کے جو دو قطعاتِ تاریخ نقل کیے گئے
ہیں، ان میں سے پہلا قطعہ مکمل نہیں۔ راقم السطور نے حسبِ ضرورت اس کے صرف دو شعر
نقل کیے تھے۔ اصلاً یہ پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ جو درج ذیل ہیں: ۔

انتقال از تپِ وبائی کرد — تفتہ، شاگردِ حضرتِ غالب
شعر فہمانِ آمل و شیراز — نظم او را ہمہ بجاں طالب
در فنِ شعر گوئے سبقت برد — از کلیم و نظیری و صائب
ریخت در پیکرِ معانی جان — داشت نطقِ مسیح در قالب
گفت سالِ وفاتِ او انجم — وائے صد حیف نائبِ غالب

(۱۲۹۶ھ)

(۲) بے صبر۔ منشی بال مکند سکندر آبادی

(الف) بے صبر کے سال ولادت سے متعلق قطعے کا آخری مصرع "ہزار دہشت ھمارو نہ آوے" (ص ۹۸) کی بجائے "ہزار دہشت ونہ آوے" ہونا چاہیے۔

(ب) بے صبر کی اولاد کے ذکر میں ان کے چار بیٹوں میں سے سب سے پہلے "چوتھے بیٹے سری کرشن سروپ" کی ولادت کا قطعہ تاریخ نقل کیا گیا ہے جس کے مصرعۂ چہارم سے ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) برآمد ہوتا ہے (ص ۹۹) بعد میں جب علیحدہ علیحدہ ان چاروں بیٹوں کے نام اور دیگر تفصیلات بیان کی گئی ہیں تو ان میں سری کرشن سروپ کا نام نہیں ملتا۔ اس کی بجائے تیسرے بیٹے کا نام کرشن چند سروپ اور چوتھے کا نام بینی سروپ بتایا گیا ہے ہری کرشن راز کی تحریر کے مطابق اول الذکر کا صحیح نام کرشن سروپ تھا۔[55] ان کا سال ولادت معلوم نہیں۔ ثانی الذکر خود مالک رام صاحب کے بقول ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے تھے اس لیے محوّلہ بالا قطعہ تاریخ انھی کی ولادت سے متعلق ہو سکتا ہے۔

(ج) بے صبر کی بعض تصانیف کے بارے میں محترم مصنف کی پیش کردہ تفصیلات میں مزید اضافوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ اضافے اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ان کتابوں تک ہر شخص کی رسائی ممکن نہیں۔

(۱) مثنوی لخت جگر:۔ منشی گوکل پرشاد کے بقول "اس میں منشی صاحب نے اصلاح سخن کا حاصل کرنا غالب دہلوی سے تحریر فرمایا ہے۔"[56] گارساں دتاسی کی تحریر کے مطابق یہ مثنوی ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی تھی۔[57] جناب ہری کرشن راز نے اسے "مطبوعہ ۱۸۸۱ء" قرار دیا ہے۔[58] ہو سکتا ہے، یہ اس مثنوی کا دوسرا ایڈیشن ہو۔ راز صاحب نے اسے اردو کی مثنوی بتایا ہے۔

(۲) اخگر عشق:۔ جناب ہری کرشن راز کے بقول یہ مثنوی بھی چھپ چکی ہے۔ لیکن اب نایاب ہے[59] "تلامذۂ غالب" میں اس کی جو تاریخ تصنیف نقل کی گئی ہے، اس کے مصرع ثانی میں "لب ہر باغ ہوا" کی بجائے "لب ہر باغ ملا" ہونا چاہیے۔

(۳) ادیب البنات:- جناب سری کرشن راز کی تحریر کے مطابق یہ کتاب ۱۸۷۰ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ اردو میں ہے اور غیر مطبوعہ ہے۔

(۴) گلستان ہند:- یہ کتاب گلستان سعدی کے تتبع میں لکھی گئی ہے لیکن اردو میں ہے سالِ تصنیف ۱۸۷۱ء ہے۔ یہ بھی غیر مطبوعہ ہے۔

(۳) تفتہ — منشی ہرگوپال

(الف) مالک رام صاحب نے تفتہ کے دہلی میں انتقال کے متعلق محمد علی خاں انجم مونگیری کے بیان کو غلط ٹھہراتے ہوئے فرمایا ہے کہ "وفات سکندرآباد میں ہوئی جیسا کہ "تاریخ بلند شہر" میں ہے۔ (حاشیہ ص ۱۸۶) لیکن "تاریخ بلند شہر" کے جس نسخے کا حوالہ دیا ہے اس کا سالِ طباعت ۱۸۶۲ء ہے۔ (ص ۵۶۹) تفتہ کی وفات (۱۸۷۹ء) سے سترہ برس پیشتر چھپی ہوئی کسی کتاب میں اس واقعے کا تذکرہ کس طرح ممکن ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ انجم کو انتقال کی تفصیلات "اودھ اخبار" سے معلوم ہوئی ہوں گی جس کے ایک شمارے میں ان کے اور دوسرے متعدد شعرا کے قطعات تاریخ شائع ہوئے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ تفتہ کا انتقال دہلی میں ہوا ہو اور ان کی آخری رسوم سکندرآباد میں ادا کی گئی ہوں۔ انجم کے بیان کو اس لیے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ انھی کے ایک قطعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کا انتقال تپ دباکی سے ہوا تھا۔

(ب) مالک رام صاحب نے تفتہ کی تصانیف کے ذیل میں "تضمین گلستان" کا ذکر فرمایا ہے لیکن اس کی طباعت و عدم طباعت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ گارساں د تاسی کی تحریر کے مطابق یہ کتاب ۱۸۷۵ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ مرزا حاتم علی مہر نے اس کی تاریخِ طباعت کہی ہے جس کے آخری مصرعے "گلدستۂ لائق از گلستاں آمد" سے ۱۲۷۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

(ج) دیوانِ دوم کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ مطبع کوہ نور لاہور (میں) ۱۸۵۷ء میں چھپا تھا۔ (ص ۱۲۰) منشی نول کشور نے اس کے بارے میں یہ اطلاع دی ہے کہ "باہتمام خاکسار مطبع کوہ نور لاہور میں اختتام کو پہونچا۔"

(د) سنبلستان کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ "یہ کتاب پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی" (ص ۱۲۲) حقیقت یہ ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۰ء میں مطبع مرآت الصحائف میرٹھ سے شائع ہوا تھا چنانچہ منشی نول کشور کا بیان ہے کہ "مثنوی سنبلستان کہ قبل ازیں میرٹھ میں طبع ہوئی تھی...... اس مطبع میں پھر طبع ہوتی ہے[۹]" غالب کے ایک خط موسومہ تفتہ مورخہ ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء میں بھی اس پہلے ایڈیشن کا ذکر بہ ایں الفاظ موجود ہے کہ "تمھارا خط میرٹھ سے آیا۔ مراۃ الصحائف کا تماشا دیکھا۔ سنبلستان کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے"۔

(ہ) تفتہ نے مثنوی نل دمن کے وزن پر ایک اور مثنوی بھی کہی تھی جس کا ذکر "تلامذۂ غالب" میں موجود نہیں۔ ۲ مئی ۱۸۶۵ء کے "اودھ اخبار" میں منشی نول کشور نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ مثنوی بر وزن نل دمن..... میں کچھ حضرت یوسف اور برادران یوسف کا سا بیان ہے۔ بعد مثنوی سنبلستان..... طبع ہونا اس کا مطبع میں شروع ہوگا[۱۰]"

(و) دیوان اول مطبوعہ مطبع اسد الاخبار، آگرہ کے سلسلے میں مالک رام صاحب کا بیان ہے کہ "منشی محمد ظہور علی خاں صاحب بہادر نائب اور مختار کل سرکار ٹونک نے از راہ قدردانی اس کے مصارف طبع میں اعانت فرمائی تھی"۔ (ص ۱۱۹، ۱۲۰) آگے چل کر ایک جگہ مولوی محمد ظہور علی صدر الصدور کول کا ذکر آیا ہے (ص ۱۲۱)، نام کے تھوڑے سے فرق کے باوجود یہ دونوں شخص واحد معلوم ہوتے ہیں۔ مولوی ظہور علی صدر الصدور کول کی قدر دانی و فیض رسانی کے سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ انھی کی توجہ سے تفتہ کے بیٹے امراؤ سنگھ کو محکمۂ دیوانی میں ایک اچھی ملازمت مل گئی تھی[۱۱]

(۴) حباب — پنڈت امراؤ سنگھ

محترم مصنف "تلامذۂ غالب" نے تازہ ایڈیشن میں حباب کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات کا اضافہ فرمایا ہے۔

غالب نے مرزا تفتہ کے نام ایک خط میں امراؤ سنگھ کا یوں ذکر کیا ہے۔

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے

رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے (گڈا ہے) جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ ان کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو میں پال لوں گا، تو کیوں مصیبت میں پھنستا ہے۔"

اس خط سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

جس زمانے میں غالب نے یہ خط لکھا ہے، تفتہ اس زمانے میں سکندرہ آباد میں مقیم تھے۔ فحوائے عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امراؤ سنگھ بھی ان دنوں سکندرہ آباد ہی میں تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امراؤ سنگھ کی دو بیویاں یکے بعد دیگرے فوت ہوئیں اور دوسری بیوی چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مری تھی۔ (ص ۱۵۳)

حقیقت یہ ہے کہ اس خط میں جن امراؤ سنگھ کا ذکر ہے، وہ امراؤ سنگھ جوہر نہیں، تفتہ کے بیٹے ہیں۔ خود مالک رام صاحب نے تفتہ کی اولاد کے سلسلے میں ان کا ذکر فرمایا ہے۔

(۵) حسین علی بیگ مرزا

مرزا صاحب موصوف کے بارے میں محترم مصنف کا ارشاد ہے:

"ان کا تخلص معلوم نہیں ہو سکا۔ ارمغان گوکل پرشاد میں ہے:

"عاقل: محمد علی دہلوی خلف مرزا حسین علی بیگ مرحوم شاگرد غالب و ذوق دہلوی...." اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین علی بیگ نے غالب اور ذوق دونوں سے مشورہ کیا تھا۔ ان کے بیٹے محمد علی عاقل کے حالات تو گوکل پرشاد کے مندرجہ صدر اقتباس میں آ ہی گئے ہیں۔" (ص ۱۵۷)

راقم السطور نے اپنے مضمون میں غالب کے پانچ نئے شاگردوں کی نشاندہی کرتے ہوئے آئندہ ایڈیشن میں ان کے ناموں کے اضافے کی گزارش کی تھی۔ ان شاگردوں میں محمد علی عاقل کا نام بھی شامل تھا۔ مالک رام صاحب نے اس کے برعکس عاقل کے والد کو تلامذۂ غالب میں شامل فرما لیا ہے جو یقیناً درست نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ گوکل پرشاد کے بیان کے مطابق غالب اور ذوق کے شاگرد محمد علی عاقل تھے، ان کے والد حسین علی بیگ

نہیں۔ گوکل پرشاد کا طریق کار یہ ہے کہ وہ شاعر کے نام کے بعد پہلے اس کے باپ کا اور اس کے بعد استاد کا نام لکھتا ہے۔ چند مثالوں سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(الف) جلالؔ:۔ "ضامن علی خلف حکیم اصغر علی داستان گو لکھنوی، شاگرد امیر علی خاں ہلالؔ و برقؔ (ص ۲۴)۔

(ب) داغؔ:۔ "نواب مرزا خاں خلف نواب شمس الدین احمد خاں، شاگرد ذوقؔ" (ص ۳۲)

(ج) سرورؔ:۔ "مرزا رجب علی بیگ خلف الرشید مرزا اصغر علی شاگرد رشید نوازش حسین خاں نوازشؔ" (ص ۴۱)

(د) سحرؔ:۔ "شیخ امان علی ولد محمد امین لکھنوی، شاگرد برقؔ" (ص ۴۱)

(ہ) شیفتہؔ:۔ "نواب حاجی محمد مصطفےٰ خاں بہادر دہلوی خلف عظیم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ، شاگرد مومن خاں مومنؔ" (ص ۴۹)

(و) صادقؔ:۔ "محمد عزیز الدین برادر محمد سعید الدین خلف مولوی اساس الدین بدایونی، شاگرد مرزا نوشہ غالبؔ" (ص ۵۳)

(ز) صباؔ:۔ "میر وزیر علی خلف میر بندہ علی شاگرد خواجہ آتش مرحوم لکھنوی" (ص ۵۳)

(ح) نادرؔ:۔ "مرزا کلب حسین خاں بہادر خلف نواب کلب علی خاں بنارسی شاگرد ناسخؔ" (ص ۸۷)

ان شعراء میں سے کسی کا سلسلۂ شاگردی نامعلوم یا مشکوک نہیں۔ اگر مالک رام صاحب کے استدلال کے مطابق محمد علی عاقلؔ کی بجائے ان کے والد مرزا حسین علی بیگ کو شاگرد غالبؔ و ذوقؔ مان لیا جائے تو ان تمام شاعروں کو بھی ان کے اساتذہ کے شاگردوں کی فہرست سے خارج کر کے ان کی جگہ ان کے والدین کے نام داخل کرنا پڑیں گے۔

مرزا غالبؔ نے منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام کئی خطوط میں اپنے ایک شناسا مرزا

حسن علی بیگ رسالہ دار کا ذکر کیا ہے جو دہلی سے برابر کول (علی گڑھ) جاتے رہتے تھے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہی مرزا حسن علی بیگ رسالہ دار محمد علی عاقلؔ دہلوی کے والد تھے۔ گوکل پرشاد یا ان کے تذکرے کے کاتب سے ان کے صحیح نام کے انضباط میں غلطی ہوئی ہے۔

اودھ اخبار کے ۱۳ جون ۱۸۷۹ء کے شمارے میں مردان علی خاں رعناؔ کے انتقال سے متعلق خبروں کے تحت "باحسرت ماتم" کے زیر عنوان عاقلؔ کا ایک قطعۂ تاریخ بھی شائع ہوا ہے جس کے عنوان اور آخری شعر کے پہلے مصرعے میں تخلص عاقلؔ کی بجائے غافلؔ لکھا ہوا ہے۔ یہ بہ ظاہر کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

(۶) خاورؔ ۔ مرزا محمد اکبر خاں قزلباش

خاورؔ کا نام "مرزا محمد اکبر خان" بتایا گیا ہے (ص ۱۶۸)۔ "فہرست ممبران کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" مرتبہ ۱۵ اپریل ۱۸۷۲ء کے مطابق ان کا صحیح نام "مرزا علی اکبر خاں" تھا۔ اس فہرست میں ان کا نام ان تفصیلات کے ساتھ درج ہے:

"سلطان الشعرا مرزا علی اکبر خاں صاحب سیتانی متخلص بہ خاورؔ ملازم سرکار پٹیالہ"[۲۱]

ہمارے نزدیک تذکروں کے اندراجات کے مقابلے میں فہرست مذکورہ کا یہ اندراج زیادہ معتبر ہے۔

(۷) ذکاؔ ۔ مولوی حبیب اللہ مدراسی

ذکاؔ کے استاد میر شمس الدین فیضؔ کے بارے میں مالک رام صاحب کا ارشاد ہے:۔

"فیضؔ ۱۲۱۵ھ میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت "وجود مظہر کل" ہے" (ص ۲۸۱ حاشیہ)

"وجود مظہر کل" سے ۱۲۱۵ھ نہیں، ۱۲۱۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ قطع نظر اس سے "عروس افکار" مرتبہ (۱۲۸۹ھ) کے مطابق فیضؔ ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔[۲۲]

(الف) تفتہ کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے

(۸) رند ۔ جانی بانکے لال

"کل ایک دوست کا خط اکبر آباد سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ ....

صورت انتظام جانی بیج ناتھ کے آنے پر موقوف ہے ..... ظاہراً اس کو

بابو صاحب کا نام نہیں معلوم، ان کے بھائی کا نام یاد رہ گیا ہے"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانی بانکے لال رند جانی بہاری لال اکبر آبادی متخلص بہ

راضی شاگرد غالب کے والد جانی بیج ناتھ کے بھائی تھے۔ مالک رام صاحب نے تفتہ

کے مرثیہ رند کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ رند اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔

(ص ۲۳۶) ممکن ہے کہ جانی بانکے لال اور جانی بیج ناتھ چچازاد بھائی ہوں۔ بہر صورت

اس بیان کی روشنی میں ان کے حالات میں وطن اور خاندان کے بارے میں اضافہ کیا جاسکتا

ہے۔

(ب) غالب منشی نبی بخش حقیر کے نام ۲۸ مارچ ۱۸۵۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کچھ اشعار جانی بانکے لال کے تفتہ نے میرے پاس بھیجے اور ایک خط

ان کا یعنی جانی جی کا اکبر آباد سے بے توسط تفتہ مجھ کو آیا...... نظم ونثر اس

شخص کی مربوط ہے۔ میں اس کو اتنا نہیں جانتا تھا"

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ رند اور غالب کے درمیان شاگردی و استادی کا رشتہ

مارچ ۱۸۵۱ء میں قائم ہوا تھا۔

(۹) سرور ۔ شیخ امیر اللہ اکبر آبادی

سرور کے بارے میں ماہنامہ "شاعر" آگرہ نمبر کے حوالے

سے مختصراً صرف اس قدر لکھا گیا ہے:

"بیٹے تھے شیخ عبداللہ کے ۔ ۱۲۴۳ھ میں دہلی میں تھے۔ غالب کے علاوہ شیخ

رحمت اللہ مجرم اکبر آبادی سے بھی اصلاح لی" (ص ۲۸۱)

"بزم غالب" کے مصنف جناب عبدالرؤف عروج نے سرور کے نام غالب کے

ایک خط کے حوالے سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کے بعد کہ غالب نے اصلاح کلام کے بارے میں ان کی درخواست پر معذرت ظاہر کر دی تھی "تلامذۂ غالب" میں ان کی شمولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ بات کسی ثبوت کے بغیر درست نہیں کہی جا سکتی"۔ جناب عروج کا یہ خیال درست نہیں کہ غالب نے سرور کے کلام پر اصلاح دینے سے انکار کر دیا تھا۔ غالب کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

"خواستہ اید کہ نتائجِ طبعِ والا مے شما بنگرم ...... اوراق اشعار بہ نظرِ اجمالی نگریستہ ام"۔

اوراق اشعار کا بہ نظر اجمالی دیکھنا تلمذ کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ مالک رام صاحب نے ان کے تعارف میں غالب کا یہ جملہ بھی نقل کر دیا ہوتا تو یہ غلط فہمی نہ پیدا ہوتی۔

(۱۰) طرزی — مولانا سید قطب الدین دلاور علی جعفری ہاپوڑی

طرزی کے حالات زندگی کے سلسلے میں مالک رام صاحب نے مولانا اطہر ہاپوڑی اور سید محمد جمیل ہاپوڑی صاحب کے خطوط کے علاوہ "یادگار ضیغم" اور "دود چراغ محفل" سے بھی استفادہ فرمایا ہے۔ غالب سے تلمذ کے سلسلے میں موصوف کا ارشاد ہے:-

"دلی کی تعلیم کے دوران ہی میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔۔۔۔۔ آغاز میں ثاقب تخلص کرتے تھے اور آزردہ سے اصلاح لیتے رہے۔ استاد نے ثاقب بدل کر تخلص طرزی کر دیا۔۔۔۔۔ اسی زمانے میں غالب سے مشورہ کرنے لگے"۔ (ص ۲۷۶)

غالب سے مشورۂ سخن کے متعلق اس بیان پر حاشیے کے تحت لکھا گیا ہے:

"تذکرۂ ضیغم" میں ہے "فن شعر میں غالب مرحوم دہلوی اور ہرگوپال تفتہ سکندرآبادی کے شاگرد ہیں"۔ اطہر ہاپوڑی مرحوم جو طرزی کے ملنے والے بلکہ ان کے کچھ رشتے دار بھی تھے، تفتہ کے تلمذ کے منکر تھے"۔

(حاشیہ ص ۳۷۶)

مالک رام صاحب نے مولانا اظہر ہاپوڑی کے حوالے سے اپنے ایک ماخذ "یادگارِ ضیغم" کے تفتہ سے تلمذ کے متعلق بیان کی تو تردید فرما دی لیکن ایک دوسرے ماخذ "دودِ چراغِ محفل" کے اس نکتہ اعتراض کی طرف توجہ نہیں فرمائی کہ

> "طرزی نے اپنے اشعار میں آزردہ اور اپنے دیگر اساتذہ کا ذکر کیا ہے لیکن غالب سے تلمذ کا کہیں اشارہ تک موجود نہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ مالک رام صاحب نے "یادگارِ ضیغم" کے کس پہ شاگردِ غالب لکھا ہے یا کوئی اور ماخذ بھی اس بات کی تائید میں ملاحظہ فرمایا ہے۔ دیوان میں معاصرین کے لیے جو دو قصیدے کہے ہیں، ان میں پہلا اپنے استاد آزردہ کی تعریف میں اور دوسرا غالب کی مدح و ثنا میں ہے۔ بقیہ اشعار میں بھی جہاں کہیں (غالب کا) ذکر آیا ہے، اپنی شاگردی کا کہیں بھی اشارہ نہیں کیا۔[۱۸]"

غالب کا بہ کثرت ذکر کرنے کے باوجود ان کی شاگردی کی طرف اشارہ تک نہ کرنا ہرگوپال تفتہ سے تلمذ کی طرح غالب سے مشورۂ سخن کے متعلق بھی صاحبِ "یادگارِ ضیغم" کے بیان کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ آزردہ اور غالب کے زمانۂ وفات میں زیادہ فرق نہیں۔ آزردہ کا انتقال پنج شنبہ، ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ (۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء) کو ہوا۔ غالب نے اس کے سات ماہ بعد ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ (۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) کو وفات پائی۔ ضیغم کا آزردہ سے نسبتِ تلمذ کا حوالہ نہ دینا بھی ان کے نقصِ معلومات پر دلالت کرتا ہے۔

(۱۱) عرشی ــ احمد حسن

(الف) عرشی کے والد مولانا سید اولاد حسن کا زمانۂ حیات ۱۸۰۵ء تا ۱۸۳۸ء متعین کیا گیا ہے (ص ۴۰۴) جناب نثار احمد فاروقی نے عرشی کے چھوٹے بھائی نواب سید صدیق حسن خاں کی تصنیف "اتحاف النبلاء" کے حوالے سے ان کا سالِ ولادت ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء بتایا ہے[۱۸]۔ بہ ظاہر موخر الذکر روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن مالک رام صاحب نے نہ تو اسے قبول کیا اور نہ اس کی

تردید فرمائی ہے۔

(ب) عرشی کے بارے میں ایک بیان یہ ہے کہ انھوں نے "کتاب وسنت کی سند مولانا سید عبدالغنی سے لی" (ص ۴۰۵) مولانا عبدالغنی کے نام کے ساتھ سید لکھنا صحیح نہیں، وہ نسباً شیخ فاروقی تھے[19]۔ ان کا اور ان کے بعض بزرگوں کا تفصیلی ذکر "تلامذۂ غالب" ہی میں صفحات ۳۳۱، ۳۳۲ کے حاشیوں میں موجود ہے۔

(۱۲) عزیز — مرزا یوسف علی خاں بنارسی

عزیز کی زندگی کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان میں بعض غلطیاں بھی در آئی ہیں اور تاریخی اعتبار سے ان کی ترتیب بھی درست نہیں۔ یہاں بہ نظر اختصار ان نقائص کی تفصیل سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ واقعات تاریخی صحت اور تسلسل کے ساتھ بیان کیے جا رہے ہیں:۔

عزیز کے والد مرزا نجف علی خاں جنوں کی علی گڑھ میں "دو ایک حویلیاں" ضرور تھیں لیکن بہ گمانِ غالب ان کا قیام زیادہ تر دہلی ہی میں رہتا تھا۔ چنانچہ ان کا انتقال بھی دہلی ہی میں ہوا[20]۔ عزیز بھی اپنے والد کی طرح برابر علی گڑھ جاتے رہتے تھے لیکن رہتے دہلی ہی میں تھے۔ دہلی میں وہ سوز خواں کی حیثیت سے بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ تھے اور تیس[30] روپیہ ماہانہ وظیفہ پاتے تھے۔ غدر کے نتیجے میں "جہاں سلطنت گئی وہاں (ان کی) تنخواہ بھی گئی"۔ اس کے بعد کچھ دنوں بلی ماران کے ایک ہندو رئیس کے لڑکوں کو پڑھایا۔ جب یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تو غالب نے "بقدر اپنی دستگاہ کے کچھ ماہینہ مقرر کر دیا" مگر بہ سبب کثرتِ عیال وہ ان کو "مکتفی نہیں تھا"[21] اس لیے اولاً انھوں نے حیدر آباد میں سلسلہ جنبانی کی لیکن وہاں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو وہ بھوپال کی طرف متوجہ ہوئے۔ "عمدة الاخبار" بھوپال مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۷۱ء (ج ۱ شمارہ ۲۵) میں ان کا ایک قصیدہ شائع ہوا تھا جو انھوں نے محلہ بلی ماران دہلی سے معتمد المہام صاحب بہادر کی معرفت نواب شاہجہاں بیگم صاحب والیۂ بھوپال کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور رئیسہ موصوفہ کی خدمت

میں "نیاز ملازمت" حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی[۱۱] ۔ انھیں اس عرضداشت کا حوصلہ افزا جواب ملا چنانچہ وہ دہلی سے ترکِ سکونت کرکے بھوپال چلے گئے ۔ لیکن ابھی روزگار کی کوئی مستقل صورت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ پیغامِ مرگ آ پہنچا اور ۱۲۸۹ھ کے اواخر یا ۱۲۹۰ھ کے اوائل (بہ گمانِ غالب فروری / مارچ ۱۸۷۳ء) میں وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

(۱۳) علی ۔ نواب علی بہادر

(الف) مالک رام صاحب کا ارشاد ہے ۔ "اورنگ خاں (اوزبک خاں) غالب کے ماموں کے بیٹے بھائی علی بہادر کے چچا ہیں تو خود غالب بھی علی بہادر ثانی کے چچا ہوئے"۔ (ص ۴۲۹)

چونکہ علی بہادر کے والد نواب ذوالفقار بہادر اورنگ خاں کے خالہ زاد بھائی تھے اس لیے ان (ذوالفقار بہادر) کے اور غالب کے درمیان بھائی کا رشتہ ہونا قطعاً ضروری نہیں۔

(ب) نواب علی بہادر کی اولاد کے ذکر میں ان کے بڑے بیٹے کا نام نواب بہادر اور علی بہادر کی وفات (۱۴ اگست ۱۸۷۳ء) کے وقت ان کی عمر انیس سال بتائی گئی ہے (ص ۴۳۱) "یادگارِ ضیغم" کے مطابق نواب بہادر کا اصل نام ذوالفقار بہادر (ثانی) تھا اور نواب بہادر ان کا عرف تھا۔ وہ ۱۲۷۲ھ میں بہ مقام باندہ پیدا ہوئے تھے لیکن تذکرے کی تالیف کے وقت (۱۳۰۲ھ) اندور میں مقیم تھے ۔ شعر بھی کہتے تھے تخلص نوشہ تھا اور اصلاح نواب کلب علی خاں نواب والی رام پور سے لیتے تھے[۱۲] ۔

(ج) علی کی مثنوی "مہر و ماہ" کا سال طباعت ۱۲۹۷ھ لکھا گیا ہے ہمارے سامنے اس مثنوی کا جو نسخہ ہے، اس کے مطابق یہ "لبت و نہم رجب المرجب سنہ ۱۲۶۷ھ" کو مولوی محمد حسین کے مطبع محمدی واقع کانپور میں طبع ہوئی تھی ۔ ۱۲۹۷ھ بہ ظاہر ۱۲۶۷ھ کی تصحیف ہے ۔

(۱۴۱) فدا — حکیم سید احمد حسین مودودی سہسوانی

راقم السطور نے اپنے تبصرے میں فدا کے متعلق جو چند باتیں عرض کی تھیں، محترم مصنف نے انھیں صد فیصد غلط نہیں سمجھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے ایڈیشن کی بعض غلطیاں اس ایڈیشن میں بھی جوں کی توں موجود ہیں۔ مثلاً۔

(الف) مالک رام صاحب کا ارشاد ہے۔

"تکمیل (علم) کے لیے دلّی پہنچے ...... تو یہاں مرزا اسداللہ خاں غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مشورہ کرنے لگے ...... دلّی سے وطن واپس چلے جانے کے بعد ان کی استاد سے خط و کتابت رہی۔" (ص ۳۳۸)

یہ بیان "حیات العلماء" پر مبنی ہے لیکن درست نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فدا اور غالب کے درمیان شاگردی و استادی کا رشتہ سید احمد حسین عرشی کی وساطت سے ستمبر ۱۸۶۰ء میں قائم ہوا تھا[1]۔ فدا اس زمانے میں ٹہرودہ میں قیام پذیر تھے۔ ان کے نام غالب کے جتنے خطوط دستیاب ہوئے ہیں، وہ سب ستمبر ۱۸۶۰ء کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان میں قدیم ترین خط ۱۹ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء کا لکھا ہوا ہے۔

(ب) مالک رام صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"ان (فدا) کے خاندان کے بعض اصحاب کا تعلق ریاست ٹہرودہ سے تھا۔ انھیں کی ترغیب پر فدا نے بھی ٹہرودہ کی راہ لی" (ص ۳۳۸)

راقم السطور نے اپنے تبصرے میں اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی کہ فدا کی والدہ مسماۃ امیر النساء سید باسط علی ساکن ٹہرودہ کی صاحبزادی تھیں۔ اس لیے ان کا "خاندان کے بعض اصحاب" کی ترغیب پر ٹہرودہ پہنچنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے والد سید محمد حسن بھی ریاست ٹہرودہ کے متوسل تھے۔ فدا کی اہلیہ قادری بیگم بھی ٹہرودہ کے سید دلیوان جی (؟) کی بیٹی تھیں۔ سید دلیوان جی اور سید باسط علی (فدا کے نانا) دونوں سادات بارہہ کے سلسلے سے تعلق

رکھتے تھے[۲۵]

(۱۵) قدر — سید غلام حسنین بلگرامی

قدر کی مثنوی "قضا و قدر" پہلی بار ۱۲۷۴ھ (۵۸-۱۸۵۷ء) میں شائع ہوئی تھی۔ سرورق پر مطبع کا نام مطبع شعلۂ طور، کانپور لکھا ہوا ہے۔ لیکن آخری صفحے (ص ۳۸) کے اندراج اور مہر کے مطابق یہ محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خاں کے مطبع نظامی میں طبع ہوئی تھی۔ "اودھ اخبار" کے ۲۰ مئی ۱۸۶۳ء کے شمارے میں اس مثنوی کے اشتہار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع نول کشور سے شائع ہوا تھا۔

(۱۶) محمود — محمد حسین لہوری

مالک رام صاحب نے محمود کی چار تصانیف "دعا نامک" (دیوان اردو)، رسالہ "حلوائے بے دود"، مثنوی "تحفۂ محمود" اور "محمود نامہ" کا ذکر فرمایا ہے (ص ۲۸۲)۔ جناب نثار احمد فاروقی نے ان کی ایک اور تصنیف "قولِ فیصل" کی نشاندہی کی تھی[۲۶] جو اس فہرست میں موجود نہیں۔ اس رسالے کا ایک نسخہ راقم السطور کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں بھی محفوظ ہے۔ سرورق کے اندراجات کے مطابق اس کا پورا نام "نئی شاعری اور پرانی شاعری کے مباحثہ پر قولِ فیصل" ہے۔ لیکن "قولِ فیصل" کو صفحے کے وسط میں جلی قلم سے اس طرح لکھا گیا ہے کہ اسے اصلی نام قرار دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ رسالہ مطبع ریاضِ ہند امرتسر سے ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں بہ صورتِ قطعات اردو شاعری پر آزاد اور حالی کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو شاعری کا دامن سادگی کے اس جوہر سے کبھی خالی نہیں رہا جس کے فقدان کا یہ حضرات شکوہ کرتے ہیں۔ آخر میں محمود کے خود چند غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

مثنوی "تحفۂ محمود" جناب مالک رام کی تحریر کے مطابق مطبع آفتابِ ہند جالندھر سے ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ رضا لائبریری رامپور میں اس مثنوی کا ایک قدیم تر ایڈیشن موجود ہے جو ذی الحجہ ۱۲۹۷ھ (نومبر ۱۸۸۰ء) میں مطبع نظامی کانپور

سے شائع ہوا تھا۔ محمود اس وقت جناب کنور سوچیت سنگھ صاحب بہادر و جناب کنور بکرمان سنگھ صاحب بہادر اہلووالیہ رئیس جالندھر کی ریاست کے ناظم تھے۔ اس مثنوی میں اشعار کی کل تعداد ۵۶۵ ہے، اور نثری رسالے "حلوائے بے دود" کی طرح یہ بھی تعلیمِ اطفال و تہذیبِ اخلاق کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔

(۱۷) محو۔ نواب غلام حسن خاں دہلوی

محو کے حالات میں ان کے اخلاف کا ذکر نہیں ہماری معلومات کے مطابق ان کے ایک بیٹے محمد حسین خاں بھی شاعر تھے اور شرر تخلص کرتے تھے[۲۶]۔

(۱۸) معجز۔ منشی آغا علی سہسوانی

محترم مصنف نے اس ایڈیشن میں منشی آغا علی کے نام کا اضافہ محررِ سطور کے تبصرے (مطبوعہ دو ماہی "اکاڈمی" لکھنؤ) کے حوالے سے فرمایا ہے (ص ۲۹۷) لیکن اس تبصرے میں کہیں بھی ان کا تخلص معجز نہیں بتایا گیا۔ یہ تخلص در اصل "تاریخِ سہسوان" کے مصنف کا ہے جنھوں نے منشی آغا علی کو شاگردِ غالب لکھا ہے۔ تبصرے کی اشاعت کے بعد ان کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی ہے وہ درج ذیل ہے:۔

منشی شیخ آغا علی کے والد کا نام منشی نادر علی تھا جو حضرت غلام علی شاہ عباسی کے فرزند تھے۔ غلام علی شاہ صاحب یا ان کے والد مہاراجا رنجیت سنگھ کے عہد میں منڈوٹہ سے ترکِ وطن کر کے سہسوان میں آباد ہوئے تھے۔ سید آل حسن امروہوی نے "نخبۃ التواریخ" میں منشی آغا علی کو ساداتِ مودودیِ سہسوان میں شامل کر لیا ہے۔ جو صحیح نہیں۔ اس کتاب کی تصنیف کے زمانے (۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء) میں موصوف امروہہ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ سہسوان میں آپ کے دادا کی بنوائی ہوئی مسجد نہایت پر فضا مقام پر واقع ہے اور غلام علی شاہ کی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ معجز سہسوانی نے "تاریخِ سہسوان" میں تیرھویں صدی ہجری کے نامور علماء و فضلاء کا

ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اس دور کے مشہور فارسی دانوں میں جو استاد سمجھے جاتے تھے، مولوی علیم اللہ، مولوی شیخ تفضل حسین، مولوی سید غلام امام، مولوی شیخ امداد حسین، مولوی احمد حسن مشربی و منشی شیخ آغا علی دلچپی مدارس کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاتے ہیں۔ ان میں دو مؤخر الذکر بزرگ عمدہ ناظم و ناثر تھے"[۲۸]۔

(۱۹) میکش ـــ میر احمد حسین دہلوی

مالک رام صاحب کا ارشاد ہے کہ (الف) میکش ۱۲۴۲ھ (۲۷-۱۸۲۶ء) میں پیدا ہوئے تھے اور (ب) زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے۔ (ص ۵۰۵) میکش کے سال ولادت کا تعین غالباً مولوی کریم الدین کے اس بیان کی بنیاد پر کیا گیا ہے کہ "عمر اس کی بائیس برس کی اس سال میں یعنی ۱۲۶۳ھ میں ہے"[۲۹]، اس حساب سے پیدائش کا صحیح سال ۱۲۴۱ھ قرار پاتا ہے جسے بر بنائے احتیاط "تقریباً" کے التزام کے ساتھ لکھنا مناسب ہوگا۔ مولوی کریم الدین نے یہ بھی لکھا ہے کہ "فارسی شعر کہتا ہے، اردو شعر نہیں کہتا"۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ میکش نے ۱۲۶۳ھ سے سات برس پہلے یعنی ۱۲۵۶ھ (۴۱-۱۸۴۰ء) میں غالب سے اصلاح لینا شروع کیا تھا۔

(۲۰) میکش ـــ ارشاد احمد دہلوی

مالک رام صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "میکش کی ساری عمر دلی میں گذری" (ص ۵۰۶) یہ اطلاع غالباً نواب علی حسن خاں کے بیان "عمرے خاک بیز کوے زبان دہلوی ماندہ"[۳۰] پر مبنی ہے۔ اولاً ہمارے خیال میں "عمرے" کا ترجمہ "ساری عمر" کرنا مناسب نہیں۔ بہ ظاہر اس سے عمر کا ایک بڑا حصہ مراد ہے۔ ثانیاً صاحب "صبح گلشن" کے مطابق میکش نے عمر کا ایک قابلِ لحاظ حصہ زبانِ دہلوی کی تحصیل میں صرف کیا تھا نہ کہ شہر دہلی کی خاک بیزی میں۔ خیال رہے کہ میکش کا اصل وطن قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر تھا اور انھوں نے عمر

کے آخری ایام بھوپال میں بسر کیے۔

(۲۱) نسیم ــــ نواب محمد حسین علی سلطان

مالک رام صاحب کو نسیم کے حالات دستیاب نہیں ہوئے۔

ان کا ذکر تذکرۂ "یادگارِ ضیغم" میں موجود ہے۔ صاحبِ تذکرہ نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نسیم کے دادا ٹیپو سلطان کے بھانجے تھے اور نانا نبگنے نواب (کذا) تھے۔ نسلاً یہ شیوخ قریشی کا خاندان تھا جسے میسور سے وطنی نسبت تھی۔ نسیم کئی زبانیں جانتے تھے اور ان میں طبع آزمائی کرتے تھے اکثر نعت شریف کہتے تھے۔ مختلف لوگوں سے مشورۂ سخن کیا تھا۔ اردو میں میر شمس الدین فیضی حیدرآبادی کے شاگرد تھے۔ تالیف تذکرہ کے وقت (۱۳۰۲ھ) ان کی عمر پچاس برس کی تھی۔

مالک رام صاحب نے نسیم کا ذکر "گلدستہ شعرا" مدراس کے حوالے سے کیا ہے۔ (ص ۵۲۱) ہمارے علم کے مطابق "گلدستہ شعرا" لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ نسیم نے اس کے لیے اپنا کلام مدراس سے بھیجا ہوگا چنانچہ "گلدستہ ناز" کے جون ۱۸۸۵ء کے شمارے میں ان کی ایک غزل اس عنوان سے شامل ہے:۔

"عالی جناب معلی القاب نواب محمد حسین علی خاں سلطان متخلص بہ نسیم جاگیردار مولور (کذا = ہرپور) نبیرۂ ٹیپو سلطان دام اقبالہم، شاگرد غالب دہلوی از مدراس"

(۲۲) نشاط ــــ ہرگوبند سہائے

محمد انصار الله نے اپنے تبصرے میں عرض کیا تھا کہ نشاط کے دیوان کا نام "نشاط الاحباب" نہیں "نشاطِ احباب" ہے۔ اس ایڈیشن میں اس کا نام حسب سابق "نشاط الاحباب" لکھا گیا ہے جو یقیناً درست نہیں۔

(۲۳) نظام ــــ نواب محمد مردان علی خاں

نظام (رعنا) کی تصانیف میں "نوائے غریب" کا نام شامل نہیں۔ کتاب کا نام تاریخی ہے جس سے اس کا سال تصنیف ۱۲۷۹ھ برآمد ہوتا ہے فن موسیقی سے متعلق ان کی دو تصانیف میں سے "نغمۂ نسیم" کا سال تصنیف ۱۲۷۹ھ

بتایا گیا ہے کہ جب کہ دوسری کتاب "غنچۂ راگ" کا سنہ تصنیف مذکور نہیں۔ اول الذکر جیسا
کہ اس کے نام کے اعداد سے ظاہر ہے، ۱۲۷۵ھ کی تصنیف ہے جب کہ آخر الذکر کے نام سے
اس کا سال تصنیف ۱۲۷۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ ان امور کی طرف گذشتہ تبصرے میں بھی توجہ دلائی
گئی تھی جسے محترم مصنف نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ "غنچۂ راگ" کا اشتہار "اودھ اخبار"
کے ۱۱ مارچ ۱۸۶۳ء مطابق ۲۰ رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ کے شمارے میں شائع ہوا
تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اسی سال مطبعِ نول کشور سے شائع ہوئی ہوگی

(۲۴) نیّر ـــ حکیم محب علی کاکوروی

مالک رام صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "تکمیل کے بعد ریاست آدا (ضلع ایٹہ) میں طبیب کی حیثیت سے ملازم ہوگئے (ص ۱۳۵) ضلع ایٹہ میں راقم السطور کے علم کے مطابق "آدا" نام کا کوئی مقام موجود نہیں۔ یہ بہ ظاہر "ادا گڑھ" ہے جسے بعض لوگ "آدا گڑھ" بھی کہتے ہیں۔

(۲۵) وحید ـــ وحید الدین احمد خاں

راقم السطور نے اپنے تبصرے میں لکھا تھا کہ گلدستہ "مشاعرہ دہلی" بابت ماہ جون ۱۸۷۸ء مطابق جمادی الآخرہ ۱۲۹۵ھ .... کے بموجب وحید اس زمانے میں دہلی میں موجود اور مشاعرے میں شریک تھے، اس لیے ۱۲۹۲ھ میں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ ان کا حیدرآباد منتقل ہو جانا قابلِ قبول نہیں۔ یہ بیان کسی مزید وضاحت کے بغیر اس ایڈیشن میں بھی بدستور موجود ہے (ص ۵۴۴)

(۲۶) ہوشیار ـــ مولوی حکیم محمد مراد علی

ہوشیار کے حالات میں ان کے زمانۂ ولادت کا ذکر نہیں "یادگارِ ضیغم" کی تالیف کے وقت (۱۳۰۲ھ میں) ان کی عمر پینتالیس برس تھی[۴۲]۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے۔

(۲۷) قلق ـــ حکیم غلام مولیٰ میرٹھی

(الف) گارساں دتاسی کی یہ روایت درست نہیں کہ "جواہر منظوم" ۱۸۶۴ء کے

ایڈیشن میں اردو ترجمے کے مقابل اصل انگریزی نظمیں بھی درج تھیں (ص ۵۶۲)

یہ بیان کسی غلط فہمی یا اصل فرانسیسی عبارت کے غلط ترجمے پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے پیش نظر ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ پریس الہ آباد سے شائع شدہ نسخہ موجود ہے۔ اس کے سرورق پر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں "دفعہ اوّل" اور "فرسٹ ایڈیشن" "تعداد اشاعت ۵۰۰" اور "قیمت تین آنہ" درج ہے۔ اس ایڈیشن کی جملہ تفصیلات ۱۸۶۷ء کے ایڈیشن کے مطابق ہیں۔

(ب) قلق کا نام غلام مولیٰ اور سال ولادت ۱۲۴۸ھ بتایا گیا ہے (ص ۵۶۳)

ہمارا قیاس یہ ہے کہ ان کا پورا نام "محمد غلام مولیٰ" ہوگا۔ حساب جمل کے مطابق اس سے ۱۲۴۹ھ برآمد ہوتا ہے جو ۳۴-۱۸۳۳ء کے مطابق ہے۔ یہی ان کا سالِ ولادت قرار پائے گا۔

"تلامذۂ غالب" کے اس تازہ ایڈیشن میں غالب کے شاگردوں کی فہرست میں متعدد نئے ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔ پچھلے ایڈیشن کے بعض تبصرہ نگاروں نے کچھ شاعروں کے غالب سے رشتۂ تلمذ پر شبہے کا اظہار کیا تھا، ان میں سے "دو ایک نام" اس لیے حذف کر دیے گئے ہیں کہ "ان کے تلمذ کے لیے کافی ثقہ شہادت موجود نہیں" لیکن باقی شاعروں کو اس اصول کے تحت کہ "اگر کسی تذکرہ نگار یا ثقہ راوی نے تلمذ کا ذکر کیا ہے تو اسے تسلیم کرنا ہی پڑے گا" بدستور زمرۂ تلامذہ میں شامل رکھا گیا ہے۔ محترم مصنف کے اس معیارِ ترجیح کو مدِنظر رکھتے ہوئے شاگردانِ غالب کی موجودہ فہرست میں مندرجہ ذیل افراد کے ناموں کے لیے مزید گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے۔ غالب سے ان لوگوں کا رشتۂ تلمذ حکیم غلام مولیٰ قلق میرٹھی کی نسبتِ شاگردی کے مقابلے میں بہرحال قوی تر ہے۔

(۱) میر افضل علی ابر — اصل وطن موضع سیکری تحصیل جانسٹھ ضلع مظفر نگر تھا لیکن مدرسہ بلند شہر سے بہ حیثیت ہیڈ مولوی وابستگی کی بنا پر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ صاحب "یادگار ضیغم" کا بیان ہے کہ فارسی میں اسد اللہ خاں غالب مرحوم دہلوی کے شاگرد ہیں۔ اردو میں مصطفےٰ خاں شیفتہ مرحوم دہلوی سے

..... تلمذ ہے[233] تذکرے کی تالیف کے وقت یعنی ۱۳۰۲ھ میں ان کی عمر اڑتالیس برس تھی[234]۔

(۲) منشی منصور علی خاں بسمل

ان کی ایک غزل ماہنامہ "جلوۂ یار" میرٹھ کے ماہ جولائی ۱۹۱۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ اس غزل کے سرِ عنوان بسمل کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:۔

جناب منشی منصور علی خاں صاحب بسمل، خوشہ چین گلزار اسدی حضرت غالب

چونکہ "جلوۂ یار" تک ہر قاری کی رسائی آسانی کے ساتھ ممکن نہیں، اس لیے اس غزل کے یہ تین اشعار سطور ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

فلک سے داد چاہیں گے تو اک حسرت سوالیں گے	اسیرانِ بلا بجز رنج و محنت اور کیا لیں گے
ترے دیوانے ہر سو کعبہ و دیر و گلستاں میں	پکاریں گے تجھی کو نام تیرا جا بجا لیں گے
ہجومِ بے خودی ہے ہم پہ یارب! کچھ نہیں کھلتا	اٹھے ہیں کس لیے کیا جانے کیا دستِ دعا لیں گے

(۳) قاضی شریف حسین خاں شریف دہلوی

مولانا ابوالفضل محمد عباس رفعت شروانی نے جو غالب کے ایک معروف شاگرد ہیں، اپنی ایک بیاض میں شریف کے چار فارسی قصیدے نقل کیے ہیں جن میں سے ایک نواب تجمل حسین خاں شوکت جنگ کی مدح میں اور تین نواب نصیر الدولہ کی تعریف میں ہیں۔ چوتھا قصیدہ اس بیاض میں حسب ذیل عنوان کے تحت منقول ہے:۔

"قصیدہ چہارم شریف حسین (کذا)، دہلوی تلمذ (کذا)، غالب"[235]

رفعت کی اس تحریر سے جس پر اعتبار نہ کرنے کی بظاہر کوئی معقول وجہ موجود نہیں، شریف کا مرزا غالب سے اصلاح لینا ثابت ہوتا ہے۔ بیاضِ رفعت[236] کے اس اندراج اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی رائے[237] سے اختلاف کرتے ہوئے قاضی وجدی الحسینی نے شریف کا صحیح نام شریف حسین بتایا ہے۔ وجدی صاحب کے بیان کے مطابق قاضی شریف حسین، ۱۲۹۷ھ میں محلہ بلی ماران دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن کٹرہ الہ آباد میں پائی۔ بعد ازاں علمائے ٹونک سے استفادہ کیا۔ ۲۶ سال کی عمر میں مفتی اکرام الدین خاں نائب صدر الصدور دہلی کی صاحبزادی سے ان کی شادی ہوئی۔ ۱۲۵۲ھ میں نواب جہانگیر محمد خان

نے انھیں دہلی سے بھوپال طلب کر کے عہدۂ قضا پر مامور کیا۔

قاضی صاحب فارسی شعر گوئی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اردو میں بھی صاحب دیوان تھے۔ یہ دیوان جس پر مولانا سیف الحق ادیب دہلوی (شاگردِ غالب) نے جابجا تعریفی نوٹ لکھے تھے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا۔ اسی زمانے یعنی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ میں انھوں نے دہلی میں وفات پائی اور مہرولی میں اندرونِ احاطۂ حضرت عبدالحق محدث دہلوی واقع شمسی تالاب دفن ہوئے۔ قبر پر کتبہ نصب ہے"[۲۶]

(۴) میجر جان جیکب

گوالیار میں فوجی خدمت پر مامور تھے۔ ۱۸۵۸ء کے "فتنہ و فساد" کے دوران میں "جوان مارے گئے"۔

"پنج آہنگ" اور "باغِ دو در" میں ان کے نام غالب کے خطوط دونوں کے درمیان رابطۂ اخلاص کے شاہد ہیں۔ غالب نے ان کے مرتب کیے ہوئے "دیوان حافظ" پر تقریظ اور ان کی فرمائش پر بعض قطعاتِ تاریخ بھی لکھے ہیں۔ "باغ دو در" میں شامل ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جیکب شاعر بھی تھے اور مرزا غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ غالب اس خط میں لکھتے ہیں۔

> دی روز کہ شنبہ بست و ہشتم[۲۸] فروری (۱۸۴۳ء) بود نامہ بگرامی خدمت در ڈاک فرستادہ شد و قطعاتِ تاریخ درست و ہموار ساختہ و آنچہ درست بود، ہمچناں گذاشتہ ورق کہ فرستادہ بودند، ہماں ورق در نوردِ نامہ فرو پیچیدہ است۔ بہ ہنگامِ خود از نظر خواہد گذشت۔ غزل ہا ہنوز بہ پرکار اندیشہ تنیز گردنہ پیمودہ ام۔ ہمانا پس از روزے چند خواہم نگریست۔

(۵) چودھری عنایت الٰہی مارہروی

غالب نے چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں لکھا ہے:-

"عنایتِ الٰہی کا کون شخص مشتاق نہ ہوگا، اس کی پرسش زائد۔ میں خدمت گزاری کو حاضر ہوں۔ وہ جب چاہیں اپنا کلام بھیج دیں"[۳۰] اس بیان کے پیش نظر اس امر کا قوی امکان ہے کہ چودھری صاحب نے اپنے کلام پر مرزا غالب سے اصلاح لی ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری

نے انھیں بجا طور پر تلامذہ غالب میں شمار کیا ہے۔ قادری صاحب کی تحریر کے مطابق چودھری صاحب موصوف چودھری غلام آلِ محمد عرف جیون علی (متوفی ۱۲۴۳ھ) کے صاحبزادے اور چودھری غلام رسول کے بھتیجے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نامور رجسٹرار چودھری عظمت الٰہی زبیری انھی چودھری عنایت علی مارہروی کے فرزند تھے۔[۵۵]

(۶) حکیم غلام نجف خاں حکیم صاحب غالب سے قریبی تعلق رکھنے والے ان لوگوں میں سے تھے جنھیں وہ بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ان کی ولادت اپنے آبائی وطن شیخوپور، بدایوں میں ہوئی تھی لیکن پانچ برس کے سن سے آخر عمر تک زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا۔[۵۶] فارسی کی تعلیم انھوں نے مرزا غالب سے حاصل کی تھی۔ شاگردی واستادی کا یہ تعلق اس قدر قوی تھا کہ یہ مرزا غالب کو مستقلاً استاد اور ان کی اہلیہ امراؤ بیگم کو استانی کہتے تھے اور دونوں کو بمنزلہ اپنے والدین کے سمجھتے تھے۔[۵۷] غالب نے ایک خط میں ان کے کسی مسودے کی اصلاح کے لیے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تم نے وہ مسودہ کیوں نہیں بھیجا۔ میں خدمت گزاری کو آمادہ ہوں"۔[۵۸] اس بیان سے ان کا اپنے مسودات پر غالب سے اصلاح لینا بھی ثابت ہے لیکن عام طور پر خیال یہ کیا جاتا ہے کہ حکیم صاحب شاعر نہیں تھے۔ شعر گوئی سے ان کے شغف کا واحد ثبوت وہ "اشتہارِ منظوم طبع پنج آہنگ مصنفہ حضرت مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب" ہے جو "اسعد الاخبار" آگرہ کے ۱۲ مارچ ۱۸۴۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ ۱۳۳ اشعار پر مشتمل اس اشتہار کے اکتیسویں شعر میں ان کا نام اس طرح نظم ہوا ہے۔

میں جو ہوں درپے حصول شرف   نام عاصی کا ہے غلام نجف

اس شعر کی روشنی میں ان اشعار کی ملکیت کے متعلق کسی قسم کا شبہ نہ ہونا چاہیے لیکن قاضی عبدالودود اس نظم کو حکیم غلام نجف کی تصنیف ماننے کے لیے تیار نہیں۔ موصوف کا ارشاد ہے۔

> غلام نجف خاں جن کے نام سے یہ اشتہار ہے، غالب کے شاگرد تھے لیکن یہ تلمذ ظاہرا فارسی پڑھنے تک محدود تھا۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر کہیں نظر نہیں آیا۔ اشتہار غالب کی طرز میں ہے اور قریب بہ یقین ہے

کہ انھیں کا لکھا ہوا ہے۔[۴۲]

اپنے اس قیاس کی بنا پر قاضی صاحب نے اس اشتہار کو کلام غالب میں شامل کر لیا ہے لیکن ہمارے نزدیک شاعر کی حیثیت سے کسی شخص کا کہیں ذکر نہ آنا ہرگز اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ شعر گوئی کی قدرت نہیں رکھتا تھا یا کوئی نظم جو اس کی طرف منسوب ہے، اس کی طبع زاد نہیں۔ چنانچہ جب تک کوئی حتمی ثبوت دستیاب نہ ہو، زیر بحث اشتہار کو حکیم غلام نجف کی بجائے مرزا غالب کی تصنیف قرار دینا درست نہیں۔

(۷) قاضی عابد علی خاں فریاد قاضی عابد علی قصبہ کاکوری کے متوطن اور قاضی محفوظ علی خاں ابن احتشام الدولہ ممتاز الملک عالی جاہ قاضی حافظ علی خاں بہادر کے فرزند تھے۔ آپ کا مفصل ذکر "تذکرۂ مشاہیر کاکوری" میں موجود ہے۔ اس تذکرے کے مطابق فریاد اردو میں نواب سید محمد خاں رند سے اصلاح لیتے تھے ـــــ اور نثر انشا پردازی میں غالب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ۲۵ شوال ۱۲۹۶ھ (۱۲ اکتوبر ۱۸۷۹ء) کو بہ عارضۂ تپ دلرزہ کاکوری ہی میں وفات پائی۔[۴۳] "کلیات نثر غالب" میں پنجشنبہ ہفتم اپریل ۱۸۵۳ء کا لکھا ہوا ایک خط شامل ہے جس کے مکتوب الیہ عابد علی خاں صاحب "تذکرۂ مشاہیر کاکوری" کے بقول یہی قاضی عابد علی خان فریاد کاکوروی ہیں۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ نے غالب کی خدمت میں اپنی نگارشات بھیجنے کے لیے ان سے اجازت طلب کی تھی۔[۴۴] یہ اطلاع دونوں کے درمیان استادی و شاگردی کے رشتے کے امکان پر دلالت کرتی ہے۔

(۸) منشی سیل چند منشی مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحریر کے مطابق "منشی سیل چند دارالانشاء (رام پور) کے افسر تھے۔ شعر گوئی کا بھی شوق تھا اور منشی تخلص کرتے تھے۔ نواب فردوس مکاں (یوسف علی خاں ناظم) کے غسل صحت کی تاریخ کا ایک شعر لکھ کر مرزا صاحب کے پاس بغرض اصلاح بھیجا تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔"[۴۵] ہمیں مولانا عرشی کی اس رائے سے اختلاف کی بظاہر کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ ایک شعر پر اصلاح کا ثبوت بہر حال

موجود ہے اور اس قسم کی کسی اور شہادت کی عدم موجودگی کی بنا پر مزید کلام کے غالب کی نظر سے گزرنے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

(۹) سید محمد زکریا شاہ نظام رام پوری نظام اصلاً شیخ علی بخش بیمار کے شاگرد تھے۔ بعض روایات کے مطابق انھوں نے اپنے مرشد میاں احمد علی احمد اور نواب یوسف علی خاں ناظم سے بھی مشورۂ سخن کیا تھا لیکن خواجہ عبدالرؤف عشرت نے ان کے استادوں میں غالب کا بھی نام لیا ہے۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ "جس زمانے میں مرزا غالب رام پور میں تھے، (نظام نے) ان کو اپنا کلام دکھایا"[۱۲۵] عشرت ثقہ راوی نہیں، اس کے باوجود ان کے اس بیان کو اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بعض دوسرے ذرائع سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ جناب شبیر علی خاں صاحب شکیب رام پوری اپنے ایک مضمون "نظام رامپوری پر شاد عارفی کی تحقیقات" میں بیمار، احمد اور ناظم سے نظام کے کسبِ فیض کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"نظام کے استادوں کے ذکر میں اس امر کا اظہار خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ متذکرۂ بالا تین استادوں کے علاوہ ان کے چوتھے استاد مرزا غالب بھی تھے۔ حال ہی میں اس کا انکشاف جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ نے رضا لائبریری رامپور میں نظام کے مسودات پر بعض اصلاحات کو دیکھ کر کیا ہے۔ ان کی رائے میں ان اصلاحوں کی تحریر مرزا غالب کے ہاتھ کی ہے۔"[۱۲۶]

فی الوقت رضا لائبریری کے مسودات تک رسائی ممکن نہیں اس لیے نظام کے مسودات سے اس دعوے کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ لیکن غالب کی شہرت و عظمت اور رام پور سے ان کے تعلق کے پیش نظر نظام کا ان سے اصلاح لینا بظاہر خارج از امکان نہیں معلوم ہوتا۔

(۱۰) نواب کلب علی خاں نواب نواب صاحب اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے فارسی نثر میں بھی

کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ فارسی شاعری میں مرزا محمد تقی سپہر سے مشورہ سخن تھا جب کہ اردو میں اصلاح کلام کی خدمت امیر مینائی کے سپرد تھی۔ دستیاب معلومات کے مطابق ایک فارسی نثر مرزا غالب کی خدمت میں بھی بہ غرضِ اصلاح بھیجی تھی۔ چنانچہ انھیں بھی وہ اپنے اساتذہ میں شمار کرتے تھے۔ غالب کے نام ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے خط میں انھوں نے یہ لکھ کر کہ "مرا ازاں مشفق واسطۂ تلمذہ بودہ است"[۵] واضح طور پر اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے، اس لیے ہمارے نزدیک ان کا نام بھی تلامذۂ غالب کی فہرست میں شامل ہونا چاہیے

"تلامذۂ غالب" بنیادی طور پر شاعروں کا تذکرہ ہے ہم نے سطور بالا میں اس کتاب میں مزید جن ناموں کے اضافے کی گزارش کی ہے، ان میں کم از کم دو (پہلے قاضی عابد علی خاں فریاد اور نواب کلب علی خاں نواب) کا شاعر ہونے کے باوجود اپنے کلام پر غالب سے اصلاح لینا ثابت نہیں لیکن ہمارے نزدیک نہ تو اصلاح و تلمذ کے سلسلے میں نظم و نثر کی تفریق مناسب ہے اور نہ نثر میں غالب سے اصلاح لینے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت محسوس ہو، اس لیے اس کتاب میں ان دو ناموں یا بہ شرطِ دریافت اس قسم کے مزید چند ناموں کا اضافہ بے محل نہ ہوگا۔

حواشی

۱۔ ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ، شمارہ ستمبر ۱۹۵۹ء

۲۔ "ارمغان گوکل پرشاد" مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، (۱۹۷۵ء) ص ۱۷

۳۔ خطبات گارساں دتاسی، (انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی ۱۹۷۹ء۔ جلد اول ص ۴۰۔

۴، ۵، ۶۔ ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ شمارہ ستمبر ۱۹۵۹ء

۷۔ خطبات گارساں دتاسی (طبع کراچی) جلد اول، ص

۱۰۹ے اودھ اخبار مورخہ ۲ مئی ۱۸۶۵ء بہ حوالہ "تحقیقی نوادر" از ڈاکٹر اکبر حیدری شائع کردہ اردو پبلشرز، تلک مارگ، لکھنؤ (۱۹۷۴ء)

۱۱ے "تلاشِ غالب" از نثار احمد فاروقی (مطبوعہ مئی ۱۹۶۹ء) ص ۱۱۲

۱۲ے "روداد اجلاس ممبران کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان منعقدہ ۱۲ مئی ۱۸۷۲ء" (مطبوعہ میڈیکل ہال پریس بنارس (۱۸۷۲ء) ص ۶۳

۱۳ے "عروس الاذکار" از نصیر الدین نقش حیدر آبادی مرتبہ افسر صدیقی امروہوی (انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی) ص ۱۲۹

۱۴ے "خطوط غالب" مرتبہ مالک رام" (انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ ۱۹۶۲ء) ص ۲۱۔

۱۵ے "بزم غالب" از عبد الرؤف عروج (ادارۂ یادگار غالب، کراچی، مارچ ۱۹۶۹ء) ص ۱۸۹

۱۶ے "کلیات نثر غالب" (طبع چہارم اپریل ۱۸۸۸ء) ص ۱۲۴، ۱۲۵

۱۷ے "دودِ چراغ محفل" از سید حسام الدین راشدی (ادارہ یادگار غالب، کراچی) ص ۲۱۶، ۲۱۷

۱۸ے "تلاش غالب" ص ۱۵۲، ۱۵۳

۱۹ے "خطوط غالب" مرتبہ مالک رام ص ۱۳۶ (مکتوب بہ نام منشی نبی بخش حقیر مورخہ ۲۳ جنوری ۱۸۵۳ء)

۲۱ے "اردوے معلیٰ" طبع اوّل (۱۸۶۹ء) ص ۵۴ (مکتوب بہ نام ذکا، مورخہ ۱۶ شعبان ۱۲۸۳ھ / ۲۴ دسمبر ۱۸۶۶ء)

۲۲ے بہ حوالہ "بھوپال اور غالب" از پروفیسر عبد القوی دسنوی (مطبوعہ بھوپال پریس، بھوپال، فروری ۱۹۶۹ء) ص ۶۷ تا ۷۳۔

۲۳ے "یادگار ضیغم" از نواب عبد اللہ خاں ضیغم (مطبع گلزار دکن، حیدر آباد ۱۸۸۵ء) ص ۳۵۰، ۳۵۱

۲۴ھ "اردوے معلّٰی" طبع اوّل ص ۲۳۹ (مکتوب بہ نام عرشی، مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء)

۲۵ھ "خزینۃ الانساب" از ابوالعلا سید نظر احمد افسوںؔ سہسوانی، (نظامی پریس بدایوں ۱۹۵۹ء) ص ۲۵۔

۲۶ھ "تلاشِ غالب" ص ۱۵۴۔

۲۷ھ بہ حوالہ گلدستہ "مشاعرۂ دہلی" بابت ماہ جون ۱۸۷۷ء۔

۲۸ھ "تاریخ سہسوان" قلمی (مملوکہ راقم) ص ۵۵۔ منشی آغا علی کے بارے میں باقی معلومات (۱) خزینۃ الانساب، حاشیہ ص ۱۹ (۲) "نخبتہ التواریخ" از سید آل حسن امروہوی (مطبوعہ مطبع عمدۃ المطابع امروہہ مارچ ۱۸۸۰ء) ص ۳۹ اور (۳) بعض بزرگوں کی فراہم کردہ اطلاعات پر مبنی ہیں۔

۲۹ھ "طبقاتِ شعراے ہند" عکسی ایڈیشن (شایع کردہ اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ) ص ۴۰۸۔

۳۰ھ "صبح گلشن" مطبوعہ مطبع شاہجہانی بھوپال (۱۲۹۵ھ) ص ۳۸۸۔

۳۱ھ "یادگار ضیغم" ص ۳۲۹

۳۲ھ "یادگار ضیغم" ص ۸۷

۳۳ھ "یادگار ضیغم" ص ۴۶

۳۴ھ بہ حوالہ "بھوپال اور غالب" ص ۸۵

۳۵ھ "بھوپال اور غالب" ص ۸۳

۳۶ھ "تاریخ قضاۃ و مفتیانِ بھوپال" از سید عابد علی وجدی الحسینی (شائع کردہ بھوپال بک ہاؤس، بھوپال ۱۹۸۶ء)

۳۷ھ "اردوے معلّٰی طبع اول ص ۱۳۶۔

۳۸ھ "غالب اور عصرِ غالب" (غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی ۱۹۸۲ء) ص ۱۰۵

۳۹ھ حکیم غلام نجف خاں کے مفصل حالات کے لیے "آثار الصنادید" از سر سید احمد خاں اور "غالب اور عصرِ غالب" از ڈاکٹر ایوب قادری کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

۴۰۔ "اردوئے معلّٰی" (طبع اول) ص ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۲۔

۴۱۔ ایضاً ص ۲۲۳

۴۲۔ "مآثرِ غالب" (طبع چہارم) ص ۲۲۷

۴۳۔ "تذکرۂ مشاہیر کاکوری" از حافظ محمد علی حیدر کاکوروی (مطبع اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء) صفحات ۲۲۶، ۲۲۷

۴۴۔ "کلیاتِ نثرِ غالب" (طبع چہارم) ص ۲۲۷

۴۵۔ "مکاتیب غالب" (طبع دوم ۱۹۴۳ء) مقدمۂ مرتب ص ۴۸

۴۶۔ "آبِ بقا" (نامی پریس لکھنؤ، طبع اول ۱۹۱۸ء) ص ۱۲۸

۴۷۔ ماہنامہ "تحریک" دہلی، شمارہ اپریل ۱۹۷۵ء

۴۸۔ "مکاتیبِ غالب (طبع دوم) متن ص ۹۰، حواشی ص ۳۳۔

(دوماہی "اکادمی" لکھنؤ، شمارہ جولائی۔اگست ۱۹۸۶ء)

چند عمدہ علمی و ادبی کتابیں

عملی استفادیات	ڈاکٹر سید محمد عقیل	۶۰/ روپے
جدید اردو تنقید پر مغرب کے اثرات	علی حماد عباسی	۵۰/ روپے
ڈاکٹر رشید جہاں حیات اور کارنامے	ڈاکٹر شاہدہ بانو	۱۰۰/ روپے
ظہیر دہلوی حیات اور فن	ڈاکٹر مختار شمیم	۱۰۰/ روپے
تلاش و تعارف	ڈاکٹر حنیف نقوی	۴۰/ روپے
لکھنؤ کی پانچ راتیں	سردار جعفری	۴۰/ روپے
بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ	ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۱۲/ روپے
شرر بہ حیثیت ناول نگار	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	۸۰/ روپے
لندن اور لندن	ڈاکٹر سید محمد عقیل	۶۰/ روپے
شعلے کی شناخت	عمیق حنفی	۳۰/ روپے
ایک نایاب مثنوی	ڈاکٹر عبد الرؤف	۱۵/ روپے
غالب ایک مطالعہ	پروفیسر ممتازہ جبین	۲۰/ روپے
مثنوی سحر البیان	ڈاکٹر اکبر حیدری	۷۵/ روپے
فراق فن اور شخصیت	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	۳۰/ روپے
ادب کی تلاش	بلراج کومل	۳۰/ روپے
تنقیدی مطالعے	ڈاکٹر شارب ردولوی	۲۰/ روپے
اردو افسانے کے افق	مہدی جعفر	۲۵/ روپے
ساحل اور سمندر	سید احتشام حسین	۳۰/ روپے
مجازیات اور شاعری	منظر سلیم	۳۰/ روپے
مغربی تنقید کے اصول	ڈاکٹر انور سجاد	۲۵/ روپے